تیسری روشنی

نفرت اور تعصب کے اندھیروں کے خلاف روشنی کا جہاد

ابو یحییٰ

انذار پبلیشرز

A Non-Profit Organization

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

نام کتاب : تیسری روشنی

ISBN نمبر :

مصنف : ابو یحییٰ

ناشر : انذار پبلیشرز: 03323051201

ویب سائٹ : www.inzaar.org

ای میل : abuyahya267@gmail.com

ٹائٹل : عبدالمتین

قیمت :

ملنے کا پتہ : پوری دنیا میں کسی بھی جگہ گھر بیٹھے یہ کتاب حاصل کرنے کے لیے رابطہ کیجیے۔

(0092)03323051201

مزید مقامات کے لیے دیکھیے ہماری ویب سائٹ دیکھیے

اہل محبت کے نام

اس کتاب کا مقصد مسلمانوں میں باہمی تفرقہ ختم کر کے
محبت اور خیر خواہی کی سوچ کو جنم دینا ہے
اس کتاب کے مطالعے کے بعد اگر ایک بھی فرد کے دل سے
نفرت اور تعصب کا اندھیرا ختم ہو گیا
تو یہ میری محنت کا حاصل ہو گا

ابو یحییٰ

فہرست ابواب

تیسری روشنی 9

فرقہ واریت اور تعصّبات کی وجوہات 14

جب اطمینان اضطراب میں بدل جائے 14

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے مخاطبین کی مثال 15

ایک انتہائی سنگین مسئلہ 16

ایک عام پڑھے لکھے غیر جانبدار شخص کا مسئلہ 16

فرقہ واریت اور گروہی تعصب کی وجوہات 18

1۔ فرع اور اصل کا فرق 18

آمین بالجہر کا معاملہ 19

2۔ جہالت اور جذباتیت 21

3۔ غیر علانیہ نبوت 23

ہمارا رویہ: اپنے ناقص علم کی بنیاد پر دوسروں کا فیصلہ 24

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ 26

4۔ منافقین اور مستشرقین کا طریقہ 28

دور بین اور خوردبین 30

متعصب لوگوں کا طریقہ 31

5۔ غیر روایتی کام کی مخالفت 33

مولانا ابوالحسن علی ندوی کا اقتباس 33

6 ۔اسلاف کا طریقہ 37

7 ۔جھوٹے پروپیگنڈے کو بلا تحقیق پھیلانا 40

شیطان یا فرشتہ 42

فرقہ واریت اور گروہی تعصب: کچھ عملی مسائل 43

معاشرتی انتشار اور فساد 43

باشعور لوگوں کو دین سے دور کرنے کا سبب 44

ایک وضاحت 44

ایک نوجوان کی داستان 46

کچھ سوالات 47

دلائل قرآن 49

سب ہی کافر 50

تمام مذاہب کا معاملہ یہی ہے 51

نصرت الٰہی 53

حق کی تلاش 55

خلاصہ فکر 56

نفرت اور تعصب کا نتیجہ 58

مذہبی اختلافات کے بارے میں کچھ متفرق تحریریں 59

پہلی تحریر

جب زندگی شروع ہوگی پر اعتراضات کا جائزہ 60

ناول کا لفظ کیوں اختیار کیا گیا؟ 62

شہید کون ہے؟ 67

دوسری تحریر

آپ کو نیند کیسے آجائے گی؟ 70

تیسری تحریر

بنی اسرائیل اور مسلمان 80

چوتھی تحریر

نظریہ سازش اور الزامی سوچ کی حقیقت 84

ایک جاسوس کی چشم کشا سرگزشت 84

نظریہ سازش 85

کتاب میں موجود تاریخی غلطیاں 86

شیخ محمد بن عبدالوھاب سے متعلق ایک تاریخی غلطی 88

دو توجہ طلب چیزیں 89

پانچویں تحریر

حرم پاک اور مسلمانوں کا تفرقہ 91

تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے 91

برصغیر میں فرقہ وارانہ تنازعے کی تاریخ 92

کل کے مظلوم آج کے ظالم 94

آپ فیصلہ کر لیجیے 97

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تیسری روشنی

میری کتاب ''جب زندگی شروع ہوگی'' کو اللہ تعالیٰ نے جو مقبولیت عطا فرمائی ہے وہ اردو زبان کی تاریخ میں کسی اور کتاب کو شاید نہیں ملی ہے۔ تاہم اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اس کتاب کو اللہ تعالیٰ نے ان گنت لوگوں کے لیے ہدایت اور رہنمائی کا ذریعہ بنا دیا ہے۔ لوگوں کی زندگیاں بدل گئیں۔ توحید اور آخرت کی بنیادی دعوت ایک زندہ حقیقت بن کر ان کے سامنے آ گئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ، آپ کے اخلاق عالیہ، آپ کی لائی ہوئی شریعت اور آپ کے عطا کیے ہوئے دین پر عمل کا سچا جذبہ پیدا ہوا۔ لوگوں نے گناہوں کی زندگی سے توبہ کی۔ نیکی کی راہ اختیار کی۔ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا راستہ اختیار کیا۔ اللہ کی سچی محبت دلوں میں راسخ ہوگئی۔ اس سے ملاقات اور اس کی جنت کے حصول کا جذبہ پیدا ہوا۔ حشر اور جہنم کی سختیوں سے بچنے کی خواہش دلوں میں گھر کر گئی۔ لوگوں میں خود قیامت کے برے انجام سے بچنے اور دوسروں کو بچانے کی سوچ عام ہوئی۔

یہ سب کچھ ہوا اور آج تک الحمدللہ ہو رہا ہے۔ اور اس پر اپنے مالک کا بے حد شکر گزار

ہوں۔تاہم یہ ایک فطری چیز ہے کہ جو چیز معاشرے میں غیر معمولی مقبولیت اختیار کرلے،اس پر کچھ نہ کچھ مخالفانہ ردعمل بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ کچھ عرصہ سے کتاب کے خلاف اکا دکا تحریریں سامنے آنا شروع ہوئیں۔میرا طریقہ یہ رہا ہے کہ جب بھی کوئی منفی بات سامنے آتی ہے میں پہلے مرحلے پر پوری دیانت داری سے یہ کوشش کرتا ہوں کہ میری غلطی اگر واضح کردی گئی ہے تو میں اس غلطی کی اصلاح کرلوں۔کوئی بات اگر کمزور ہے تو اسے دور کردوں۔

اپنی غلطی واضح نہیں ہوتی تو میں پروردگار سے دعا کرتا ہوں کہ پروردگار!اگر یہ کتاب کسی گمراہی کا سبب ہے تو سب سے پہلے میں اس کے شر سے تیری پناہ مانگتا ہوں اور تیری بارگارہ میں دعا کرتا ہوں کہ اس کتاب کے پھیلنے کے راستے مسدود کردے۔اور اگر یہ تیری مرضی اور رضا کے مطابق ہے تو اپنی خصوصی نصرت بھیج کر اس کتاب کو مزید پھیلا تا کہ زیادہ سے زیادہ لوگ تیرے قریب آسکیں۔

الحمدللہ تادم تحریر یہ کتاب رکنے کے بجائے پھیلتی چلی جارہی ہے۔میرے مالک کی عنایت سے انتہائی کم وقت میں یہ اردو کی سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب بن چکی ہے۔ہر مخالفانہ تحریر کے بعد میں یہی دعا کرتا ہوں اور ہر دفعہ کتاب پہلے سے زیادہ پھیل جاتی ہے۔اس ضمن میں ایسے ایسے واقعات میرے سامنے آئے ہیں کہ دل تو چاہتا ہے کہ انہیں بیان کروں،مگر شاید اس میں خودستائی کا عنصر نہ داخل ہوجائے،اس لیے اس سے صرف نظر کرکے میں اصل بات کی طرف آتا ہوں۔

پچھلے دنوں بعض حضرات نے کتاب کے خلاف باقاعدہ مہم شروع کردی۔ایسے میں قارئین اور احباب کی طرف سے یہ مطالبہ شدت کے ساتھ سامنے آیا کہ میں اس کا کچھ جواب لکھوں۔میں اس طرح کی منفی چیزوں کا جواب لکھنے کو وقت کا زیاں تصور کرتا ہوں۔جو قلم ایمان واخلاق کی دعوت کے فروغ کے لیے وقف ہو،اس کی حفاظت اللہ تعالیٰ خود فرماتے ہیں۔مزید یہ کہ منفی سوچ رکھنے والوں کے پاس کبھی الفاظ ختم نہیں ہوتے۔آپ ان کی غلطی کتنی ہی واضح کردیں وہ ہر بات

کے جواب میں ایک نئی اور غیر متعلقہ بحث چھیڑ دیں گے۔اب یا تو انسان خاموش ہوکر اپنا مثبت کام کرتا رہے یا پھر طے کرلے کہ اسے سارے کام چھوڑ کر ایسے لوگوں کو گھر تک پہنچانا ہے۔پہلی صورت میں منفی پروپیگنڈا پھیلتا چلا جاتا ہے اور ایمان کی دعوت کو سخت نقصان پہنچتا ہے اور دوسری صورت میں انسان کے پاس اپنا اصل کام کرنے کا وقت ہی نہیں رہتا۔

اس وقت بھی صورتحال یہ ہے کہ میں اپنی زندگی کی سب سے بڑی تصنیف ''قرآن کا مطلوب انسان'' پر نظر ثانی کررہا ہوں۔یہ کتاب یعنی ''قرآن کا مطلوب انسان'' امت کے علمی ذخیرے میں انشاءاللہ ایک منفرد اضافہ ہوگا جس میں قرآن وحدیث کے صریح ترین الفاظ میں لوگ یہ جان لیں گے کہ وہ کیا اعمال ہیں جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو مطلوب ہیں۔جنت اور جہنم کا دارومدار دراصل کن چیزوں پر ہے۔دین کی اصل ترجیحات اور اس کے بنیادی مطالبات کی نوعیت کیا ہے۔

مگر ایسے میں یہ مسئلہ شدت کے ساتھ سامنے آگیا اور میں تذبذب کا شکار ہوگیا کہ کیا کروں۔ایسے حالات میں میں اپنے مالک کے سامنے سجدہ ریز ہوگیا۔اس آقا کا میں کس منہ سے شکر ادا کروں کہ ہمیشہ کی طرح اس نے اس گناہ گار کی لاج رکھی اور ایک ایسی چیز کی طرف میری رہنمائی کردی جو انشاءاللہ العزیز اس معاشرے سے تعصب اور فرقہ واریت کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دے گی۔

اللہ تعالیٰ نے مجھ پر یہ بات واضح کردی ہے کہ میں ایک حقیر انسان ہوں جس کے کام کے دفاع کی نہ کوئی ضرورت ہے اور نہ کوئی اہمیت ہے۔البتہ یہ بات بہت اہم ہے کہ اس معاشرے سے فرقہ واریت اور گروہی تعصب ختم ہو۔درحقیقت یہ وہ چیزیں ہیں جو لوگوں کو انبیا ورسل کا بھی دشمن بنادیتی ہیں۔یہ ایسا مرض ہے جو اپنے مریض کو پروردگار کے غضب میں مبتلا کردیتا ہے۔اس مرض کے شکار لوگ تعصب میں اندھے ہوکر وقت کے نبی کو بھی قتل کردیتے ہیں۔انہی چیزوں کی بنا پر آج بھی یہ صورتحال ہے کہ کون سا معروف عالم اور کون سا مکتبہ فکر اور مسلک نہیں

جس کے بارے میں مخالف گروہ کی طرف سے کفر اور گمراہی کا فتویٰ نہیں ہے۔

ہمارے ہاں آج کفر وضلالت کے فتووں سے لے کر بے گناہ انسانوں اور علمائے کرام کے قتل جیسے سنگین جرائم کے پیچھے بھی گروہی تعصب اور فرقہ واریت کا یہی مرض ہے۔ تاہم اس مرض کے پھیلنے کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ جو لوگ یہ سارے کام کر رہے ہوتے ہیں وہ اللہ اور اس کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر کھڑے ہوتے ہیں۔ ایک عام آدمی نیک دلی کے ساتھ ان کے پیچھے جاتا ہے اور فرقہ واریت اور تعصب کی زنجیروں سے خود کو جکڑتا چلا جاتا ہے۔ وہ ایمان واخلاق کی دنیا کے بدترین جرائم کا ارتکاب کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ وہ کوئی دینی خدمت سرانجام دے رہا ہے۔ اس کے پاس کوئی ایسا معیار ہی نہیں ہوتا کہ وہ جانچ سکے کہ جن کو وہ رہنما سمجھ کر ان کے پیچھے ہولیا ہے وہ کس طرح غلط ہو سکتے ہیں۔

مگر الحمدللہ پروردگار کی عنایت اور مالک کے کرم سے اس کا یہ عاجز بندہ اب تمام مسلمانوں کے سامنے ایک کسوٹی پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہے جس کی مدد سے لوگ یہ جانچ سکیں گے کہ کون سچا ہے اور کون جھوٹا۔ کون رب کی طرف بلا رہا ہے اور کون اپنے تعصّبات کا اسیر ہے۔ کون شیطان کے مشن کی تکمیل کر رہا ہے اور کون انبیا علیہم السلام کا جانشین ہے۔ کون ہدایت پر ہے اور کون گمراہی پھیلا رہا ہے۔ گویا ''قرآن کا مطلوب انسان'' سے قبل میں یہ واضح کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں کہ ''قرآن کا نامطلوب انسان'' کیا ہوتا ہے۔

پیش نظر تالیف میں کچھ ایسے واضح اور روشن اصول لوگوں کے سامنے رکھ رہا ہوں جن کی بنیاد پر ایک عام آدمی ہر طرح کے کنفیوژن سے بالاتر ہو کر صحیح وغلط کا فیصلہ کر سکے گا۔ کتاب کے آخر میں میری بعض دیگر تحریریں شامل ہیں جو ''جب زندگی شروع ہوگی'' کے حوالے سے سامنے آنے والے کچھ اہم سوالات کا جواب بھی دیتی ہیں اور ساتھ میں کچھ ایسے رویوں پر بھی توجہ دلاتی ہیں جو نفرت اور تعصب پھیلانے کا باعث بنتے ہیں۔ میری ہر مسلمان سے جو اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ ایک

روز اسے میدان حشر میں پیش ہو کر اپنے اعمال کا جواب اس طرح دینا ہے کہ خدا کے غضب سے بچانے کے لیے اس روز کوئی نہیں آئے گا، یہ درخواست ہے کہ وہ ایک بار اس تحریر کو اول تا آخر پوری توجہ سے پڑھے اور جب کبھی اس کے پاس کسی بھی نقطہ نظر، مسلک، کتاب، عالم اور فرد کے خلاف نفرت پھیلانے والا مواد سامنے آئے تو وہ ان اصولوں کی روشنی میں ان کا تجزیہ کر لے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ عمل اسے قیامت کی ایک بہت بڑی ذلت اور رسوائی سے محفوظ کر دے گا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس کاوش کو اپنی بارگاہ میں قبول فرما کر امت میں اتحاد اور یکجہتی کا ذریعہ بنا دے۔ اپنی تصنیف کے خلاف پروپیگنڈا کرنے والوں کے لیے میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ہدایت کے لیے دعا کرتا ہوں۔ میرے دشمن یہ لوگ نہیں شیطان ملعون ہے۔ شیطان گمراہی کے اندھیروں کا پجاری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس حقیر غلام کو شیطان کے خلاف جنگ کے لیے چنا اور یہ عزت عطا کی کہ اس کی پچھلی دو کتابوں نے ان گنت لوگوں کو شیطانی اندھیروں سے نکال کر ہدایت کی روشنی تک پہنچایا ہے۔ میری پہلی کتاب ''جب زندگی شروع ہوگی'' نے لوگوں میں ایمان اور توبہ کی منادی کی۔ دوسری کتاب ''قسم اُس وقت کی'' نے دین اسلام پر لوگوں کا اعتماد بحال کیا اور اب انشاءاللہ یہ کتاب ''تیسری روشنی'' بن کر سامنے آئے گی۔ انشاءاللہ اس کتاب کو پڑھ کر ایک مخلص مسلمان فرقہ واریت، نفرت اور گروہی تعصب کے اندھیرے سے نکل کر ہدایت، محبت اور معرفت کی روشنی میں آجائے گا۔ مسلمانوں میں اتحاد پیدا ہوگا اور مسلمان مل کر ہدایت کی اس روشنی سے دنیا کو منور کریں گے جو ان کے پاس ان کے محبوب پیغمبر کی امانت ہے۔

باقی جو لوگ اپنے تعصّبات کی قید سے نکلنا ہی نہیں چاہتے تو اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ ان کے شر سے مجھے اور ہر مسلمان کو محفوظ رکھے۔ اللھم انا نجعلك فی نحورھم و نعوذبك من شرورھم۔ اللھم انی اعوذبك من الفتن ما ظھر منھا وما بطن۔

بندہ عاجز

ابویحییٰ

فرقہ واریت اور تعصّبات کی وجوہات

جب اطمینان اضطراب میں بدل جائے

ایک عام انسان دین کو اپنے قلبی سکون کے لیے اختیار کرتا ہے۔ بے شک دین اسلام میں ایسی تاثیر ہے کہ وہ اپنے قبول کرنے والوں کو سکون دیتا ہے۔ اللہ کی یاد اور پیغمبر علیہ السلام کی زندگی، سیرت اور اخلاق عالیہ میں ایسا اطمینان ہے کہ انسان زندگی کی ہر مشکل کو ہنس کر جھیل جاتا ہے۔ تاہم یہ سکون بخش دین اس وقت انسان میں زبردست اضطراب پیدا کر دیتا ہے جب مذہبی اختلافات کی داستان انسان کے سامنے آتی ہے۔ کفر کے فتوے، گمراہی کے سرٹیفکیٹ، سازشوں کی داستانیں غرض تنازعات اور اختلافات کی دنیا انسان کا ذہنی سکون درہم برہم کر دیتی ہے۔ جن شخصیات کو انسان معتبر سمجھتا ہے وہ غیر معتبر ہو جاتی ہیں۔ جس نقطہ نظر کو انسان باعث نجات سمجھتا ہے، وہ گمراہی اور ضلالت قرار پاتا ہے۔ جس راستے کو انسان نجات کا راستہ سمجھتا ہے وہ عذاب کا راستہ بن جاتا ہے۔ جس منزل کو وہ جنت کا نشان سمجھتا ہے وہ جہنم کی کھائی نظر آنے لگتی ہے۔

ایسے میں انسان کسی خاص نقطہ نظر کا اسیر ہے تو اپنے نقطہ نظر کے خلاف دو سطریں پڑھنا بھی اس کے لیے باعث اذیت ہو جاتا ہے۔ ایسے میں اپنے بڑوں کی طرف سے اسے آسان ترین راستہ یہ بتایا جاتا ہے کہ صرف ہماری بات سنو۔ ہمارے علاوہ ہر شخص گمراہ ہے۔ چنانچہ انسان صرف اپنے نقطہ نظر کی باتیں سنتا اور پڑھتا ہے اور اسی میں خوشی محسوس کرتا ہے۔ تاہم اس

طریقے میں سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ ہوسکتا ہے کہ انسان واقعی غلط جگہ کھڑا ہو۔ اور کل قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسے یہ بتایا جائے کہ جن باتوں کو تم حق سمجھ بیٹھے تھے، ان کا ایک حصہ بالکل غلط تھا۔ تم نے اپنے لیڈروں کی اندھی پیروی کی اور گمراہی کا راستہ اختیار کر لیا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے مخاطبین کی مثال

اس سلسلے کی سب سے نمایاں مثال خود حیات طیبہ میں ملتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو عام لوگوں کی نظروں میں غلط ثابت کرنے کے لیے کفار نے آپ پر بدترین الزامات لگائے۔ مجنون، جادوگر، شاعر اور دیگر انتہائی گستاخانہ کلمات دن رات آپ کے بارے میں کہے جاتے تھے۔ آپ کی شخصیت، سیرت، افعال، ازدواجی زندگی اور جنگ و جہاد کے معاملات میں ہر پہلو سے کیڑے نکال کر آپ کو غیر معتبر کرنے کی کوشش کی گئی۔ یہ سب کچھ کفار اور منافقین کی لیڈرشپ نے کیا مگر قرآن مجید میں واضح ہے کہ ان کی پیروی کرنے والے بھی قیامت میں عذاب میں ہوں گے اور جسمانی عذاب کے ساتھ اس روحانی اذیت کو بھی سہیں گے کہ انہوں نے کیوں اپنے لیڈروں کی پیروی کی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

> ''بے شک اللہ نے کافروں پر لعنت کر چھوڑی ہے اور ان کے لیے آگ کا عذاب تیار کر رکھا ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ وہاں نہ ان کا کوئی کارساز ہوگا اور نہ کوئی مددگار۔ جس دن ان کے چہرے آگ میں الٹے پلٹے جائیں گے۔ وہ کہیں گے: کاش! ہم نے اللہ کی اطاعت کی ہوتی اور ہم نے رسول کی اطاعت کی ہوتی! اور کہیں گے: اے ہمارے رب! ہم نے اپنے سرداروں اور بڑوں کی بات مانی تو انھوں نے ہمیں راہ سے بھٹکا دیا۔: اے ہمارے رب! ان کو دوگنا عذاب دے اور ان پر بہت بھاری لعنت کر!''، (احزاب 33:68-64)

ایک انتہائی سنگین مسئلہ

ظاہر ہے کہ مذکورہ بالا معاملہ کفار کا ہے جنھوں نے اپنے لیڈروں کی باتوں میں آ کر رسول کریم علیہ السلام کا انکار کیا۔ مگر کوئی سچائی کتنی چھوٹی کیوں نہ ہو اس کا انکار اپنی ذات میں ایک جرم ہے۔ مزید یہ کہ فرقہ وارانہ اختلافات میں نہ صرف دوسرے فریق کی بات سننے سے انکار کیا جاتا ہے بلکہ دوسرے نقطہ نظر کو باطل قرار دے کر فوراً کفر اور گمراہی کی ایک مہم شروع کر دی جاتی ہے۔ جبکہ صحیح روایات کے مطابق یہ ایک انتہائی خطرناک معاملہ ہے۔ ارشاد نبوی ہے۔

''تم میں سے کوئی آدمی جب اپنے بھائی کو کافر کہے تو دونوں میں سے ایک اس کا مستحق بن جاتا ہے۔ یا تو وہی (سننے والا) کافر ہوتا ہے جیسا کہ کہنے والا اسے کہتا ہے یا پھر (سننے والا) نہیں ہے تو پھر یہ کہنے والے پر پلٹ آئے گا۔'' (بخاری، رقم 5752)

یہ ظاہر ہے کہ انتہائی سنگین معاملہ ہے۔ کفر کا نتیجہ جہنم کی وہی آگ ہے جس کا ذکر اوپر قرآن کے حوالے سے بیان ہوا ہے۔ پھر آخرت کے علاوہ دنیا میں بھی ہم جانتے ہیں کہ یہ اختلاف، تعصب اور فرقہ واریت وہ آگ ہے جو ہمارے معاشرے میں نفرت، دہشت اور قتل و غارت گری پھیلا رہی ہے۔ ان کے علاوہ یہ پڑھے لکھے اور باشعور لوگوں کو دین سے دور کرنے کا سبب بن رہی ہے۔

ایک عام پڑھے لکھے غیر جانبدار شخص کا مسئلہ

اس معاملے کا ایک دوسرا پہلو یہ ہے کہ ایک عام غیر جانبدار شخص جو دین کا زیادہ علم نہیں رکھتا، وہ بے چارہ کبھی دو فریقوں میں سچائی جاننے کی کوشش بھی کرے تو اس کا علم اس بات کی اجازت ہی نہیں دیتا کہ وہ فنی مباحث اور علمی اختلافات کو سمجھ سکے۔ وہ جس فریق کی بات سنے گا، اسے لگے گا وہی ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ایک عام آدمی ان چیزوں کو سمجھنے کے لیے زیادہ وقت نہیں نکال سکتا اور اگر نکالے گا تو آخر کار وہ اہل علم کے پاس ہی جائے گا۔ اور اس بات کا امکان ہے کہ وہ اسے

صرف اپنے نقطہ نظر کی درستی اور دوسروں کی غلطی پر قائل کرنے کی کوشش کریں گے۔

ایسے میں یہ ضروری ہے کہ ایک عام آدمی کے سامنے کچھ ایسی موٹی موٹی چیزیں آ جائیں جن سے وہ سمجھ سکے کہ جب اہل علم ایک دوسرے پر تنقید کرتے ہیں تو کس کی بات درست ہونے کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔ وہ کون سے غیر جانبدارانہ اصول ہیں جو کسی شخص کے تعصب کو بھڑکائے بغیر اور اس کے نقطہ نظر کو چیلنج کیے بغیر اس کے سامنے وہ معیار رکھ سکتے ہیں جن کی بنیاد پر وہ اپنے لیڈروں کے دعووں کو پرکھ سکے۔ تاکہ کل قیامت کے دن اللہ تعالیٰ جب اس سے سوال کرنا شروع کریں تو وہ یہ نہ کہے کہ ہم نے اپنے لیڈروں کی پیروی کی تھی۔ جو انہوں نے کہا وہ ہم نے مان لیا۔ بلکہ وہ اپنے شعوری علم کی بنیاد پر جواب دے۔ ہم کسی طور اس جواب دہی سے روز قیامت بچ نہیں سکتے۔ ایمان لانے کی آزمائش اگر غیر مسلموں کے لیے ہے تو سچائی کو سمجھنے اور اس کا انکار نہ کرنے کی ذمہ داری ایک مسلمان کی بھی ہے۔

''بے شک اللہ نے کافروں پر لعنت کر چھوڑی ہے اور ان کے لیے آگ کا عذاب تیار کر رکھا ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ وہاں نہ ان کا کوئی کارساز ہوگا اور نہ کوئی مددگار۔ جس دن ان کے چہرے آگ میں الٹے پلٹے جائیں گے۔ وہ کہیں گے: کاش! ہم نے اللہ کی اطاعت کی ہوتی اور ہم نے رسول کی اطاعت کی ہوتی! اور کہیں گے: اے ہمارے رب! ہم نے اپنے سرداروں اور بڑوں کی بات مانی تو انھوں نے ہمیں راہ سے بھٹکا دیا۔: اے ہمارے رب! ان کو دوگنا عذاب دے اور ان پر بہت بھاری لعنت کر!''، (احزاب 33:68-64)

فرقہ واریت اور گروہی تعصب کی وجوہات

ذیل میں کچھ ایسے نمایاں اصول بیان کیے جا رہے ہیں جو اس معاملے میں ایک عام آدمی کی بھرپور رہنمائی کریں گے کہ مذہبی اختلافات کی شکل میں کون سا نقطہ نظر درست ہو سکتا ہے اور کون سا غلط۔

1۔ فرع اور اصل کا فرق

اللہ تعالیٰ کا انسانیت پر خصوصی کرم یہ ہے کہ اس نے ختم نبوت کے بعد ہدایت کو باقی رکھنے کا بھرپور اہتمام کیا ہے۔ اس کا طریقہ یہ اختیار کیا گیا ہے کہ دین کی بنیادوں یعنی قرآن کریم اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو مکمل طور پر محفوظ کر دیا ہے۔ یہ حقیقت قرآن مجید میں بھی بیان ہوئی اور متعدد احادیث میں بھی اس کا ذکر ہوا ہے۔

اس پوری فکری اور عملی دینی روایت میں کچھ اصولی اور بنیادی باتیں اور کچھ فروعی چیزیں ہیں۔ کچھ اصل اور بنیادی احکام ہیں اور کچھ ان کے حصول میں مددگار ہوتے ہیں۔ کچھ احکام مقاصد کا درجہ رکھتے ہیں اور کچھ سد ذریعہ (اصل ممانعت سے روکنے کے لیے ان ذرائع سے روکنا جو اس حرام میں مبتلا کر سکتے ہیں) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کچھ چیزیں بالکل واضح، بین اور روشن ہیں اور کچھ کو جان بوجھ کر مبہم اور غیر واضح چھوڑ دیا گیا ہے۔

گروہی تعصب اور فرقہ واریت کو پیدا کرنے والی سب سے بنیادی چیز دراصل یہی ہے کہ لوگ اصل چیزوں کو چھوڑ کر یا غیر اہم سمجھ کر فروعیات کو دعوت کا موضوع بنا لیتے ہیں۔ یہاں رک جائیے اور میرا جملہ دوبارہ پڑھیے۔ میں نے یہ نہیں کہا کہ فروعیات پر غور نہیں کرتے۔ میں نے یہ

لکھا ہے کہ فروعیات کو دعوت کا موضوع بنا لیتے ہیں۔ فروعیات پر غور کرنے اور ان کو دعوت کا موضوع بنا لینے اور خود اصول و فرع میں کیا فرق ہے اور ان کی باہمی جگہ بدل دینے سے کیا ہوتا ہے میں اسے ایک مثال سے واضح کرنے کی کوشش کروں گا۔

آمین بالجہر کا معاملہ

نماز دین کا بنیادی حکم ہے۔ اس کا مقصد قرآن مجید کے مطابق اللہ کی یاد قائم کرنا ہے۔ اس کا عملی طریقہ ہم تک اس طرح پہنچا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور سے لے کر آج تک نسل در نسل لوگ نماز پڑھتے اور اپنے بچوں کو سکھاتے چلے آئے ہیں۔ اس عملی اہتمام کے علاوہ اہل علم ہمیشہ اپنی تحریر و تقریر میں نماز پر گفتگو کر کے اس کا طریقہ واضح کرتے رہے ہیں۔ اس طریقے میں یہ بات شامل ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے مطابق قیام میں سورہ فاتحہ کی تلاوت کے بعد آمین کہی جائے، (بخاری، رقم 782۔ مسلم، رقم 915)۔ اس آمین کی آواز کتنی بلند ہو یہ سرتاسر ایک فروعی مسئلہ ہے۔ اس لیے اس پر اہل علم میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس اختلاف سے نہ نماز باطل ہوتی ہے اور نہ اللہ کے ہاں اس کی قبولیت پر کوئی سوال پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے یہ بحث اگر اہل علم کے درمیان ہی رہے وہ اپنی تحریروں میں اسے موضوع بنا لیں، اس پر تحقیق کریں، اپنی مجالس میں اس پر تبادلہ خیال کریں، دلائل کا تبادلہ کریں، ایک دوسرے پر اپنا نقطہ نظر واضح کر کے انہیں قائل کرنے کی کوشش کریں تو اس سے کوئی فساد برپا نہیں ہوگا۔

لیکن جیسے ہی یہ چیزیں منبروں کا موضوع بنیں گی، وعظ و تبلیغ کا مواد قرار پائیں گی، دعوتی تحریروں اور تقریروں میں زیر بحث آنے لگیں گی، ہدایت اور گمراہی کا معیار قرار پائیں گی، یہ معاشرے میں بدترین فساد پھیلانے کا سبب بن جائیں گی۔ تھوڑے عرصے پہلے تک اس ''آمین'' کا یہی معاملہ تھا۔ مجھے اپنی نوعمری کے وہ واقعات اچھی طرح یاد ہیں کہ جب ہماری مسجد میں کوئی

شخص آ کر بلند آواز سے آمین کہہ بیٹھتا تھا تو نماز کے بعد لوگ اس طرح اسے گھور گھور کر دیکھتے تھے کہ اس کا مسجد میں ٹھہرنا دوبھر ہو جاتا تھا۔ مگر الحمدللہ عمرہ و حج پر بکثرت عوام کے جانے کا یہ فائدہ ہوا ہے کہ اب لوگوں کو اندازہ ہو چکا ہے کہ یہ کوئی ایسا اہم مسئلہ نہیں۔ جس نے زور سے آمین کہنا ہے وہ کہے اور جو چاہے آہستہ کہے۔ اللہ تعالیٰ دونوں صورتوں میں اس آمین کو توجہ سے سنتے ہیں۔

اس بحث سے واضح یہ ہوا کہ اس امت کے اہل علم میں اصل معاملات پر کوئی اختلاف نہیں ہوتا۔ اختلاف صرف اور صرف جزوی اور فروعی چیزوں پر ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اہل علم اپنی اپنی تحقیق کے لحاظ سے جن نتائج تک پہنچیں گے بہرحال اسے بیان کریں گے۔ اس میں کوئی حرج نہیں۔ بلکہ یہ ایک اچھی علمی روایت ہے۔ اسی کی بنا پر ہمارا دین ہر طرح کے حالات میں قابل عمل رہنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ مگر جیسے ہی یہ نتائج فکر دعوتِ دین کا عنوان بنیں گے، مسئلہ پیدا ہو جائے گا۔ یہ مسئلہ اس وقت مزید سنگین ہو جاتا ہے جب لوگ ان فروعیات کو اصل کی جگہ لے جاتے ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ اہم بنا دیتے ہیں۔ انہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ فرع میں اختلاف کرنے والا اصل میں ان کے ساتھ ہی کھڑا ہے۔ ان کے نزدیک فرع اتنی اہم ہو جاتی ہے کہ وہ اصل کے اتفاق کو بالکل بھول کر فروعی اختلاف کی بنا پر فتویٰ بازی کر دیتے ہیں اور پھر آہستہ آہستہ ایک فرقہ اور متعصب گروہ وجود میں آ جاتا ہے۔

اکثر فرقہ وارانہ اختلافات کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ لوگ اصل کو بھول کر فرع کو اہم بنا دیتے ہیں۔ وہ تولہ کا سیر اور ذرہ کا پہاڑ بنا دیتے ہیں۔ اہمیت کی یہ تبدیلی (Shift of Emphasis) جب ہو جاتی ہے تو غیر اہم چیز اہم بن کر دعوت کا موضوع بنتی ہے۔ لوگ فروعی چیزوں کی طرف بلاتے ہیں۔ فروع میں ہمیشہ اختلاف ہوتا ہے، مگر ایسے لوگ چونکہ فرع کو اصل بنا چکے ہوتے ہیں اس لیے وہ اس اختلاف کو اصل کا اختلاف قرار دے کر کفر و گمراہی کے فتوے لگانا شروع

کرتے ہیں اور آخر کار بات ایک جدا فرقہ بننے پر جا کر ختم ہوتی ہے۔

اس لیے تعصّبات اور فرقہ وارانہ اختلاف کو سمجھنے کا پہلا بنیادی اصول یہ ہے کہ یہ اختلافات کرنے والے زیادہ تر فروعیات پر بات کرتے ہیں اور ان کو حق و باطل کر مسئلہ بنا دیتے ہیں۔ جبکہ یہ رویہ سرتاسر ایک غلط رویہ ہے جو فساد اور انتشار کا باعث بنتا ہے۔

2۔ جہالت اور جذباتیت

فرقہ واریت اور گروہی تعصّبات کو پھیلانے کا دوسرا اہم اور بنیادی سبب جذباتیت اور جہالت ہے۔ جیسا کہ پیچھے بیان ہوا ہے کہ فروعی معاملات میں اہل علم میں ان کی تحقیق کے لحاظ سے اختلاف ہو ہی جاتا ہے۔ مگر محقق اہل علم کی حد تک یہ اختلاف صرف علمی اختلاف رہتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ محقق علما بالعموم یہ جانتے ہیں کہ گرچہ انہوں نے ایک رائے قائم کی ہے مگر اس معاملے میں دوسروں کی مختلف آراء بھی موجود ہیں۔ نیز وہ دین کی اصل اور فرع کا فرق بالعموم اچھی طرح سمجھتے ہیں۔

بدقسمتی سے بڑے اہل علم کے رخصت ہونے کے بعد ان کی جگہ کچھ ایسے لوگ سنبھالتے ہیں جن کا علم و تحقیق سے کچھ زیادہ واسطہ نہیں ہوتا۔ یہ اسلاف کا نام تو لیتے ہیں، مگر شاذ ہی کبھی اسلاف کی کتابیں انہوں نے پڑھی ہوتی ہیں۔ یہ علم کی بات تو کرتے ہیں مگر مسلمانوں کی شاندار علمی روایت کی انہیں کوئی خبر نہیں ہوتی۔ ان کا کل سرمایہ علم اپنے مسلک، اپنے گروہ، اپنی تنظیم اور اپنی جماعت کا لٹریچر ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کا لٹریچر اپنے نقطہ نظر کو درست ثابت کرنے کے لیے لکھا گیا ہوتا ہے، یہ کبھی سلف و خلف کے تمام علم اور تمام اہل علم کی آراء اور ان کے دلائل کا بیان نہیں ہوتا۔ اس لٹریچر میں اگر کبھی دوسروں کی بات نقل ہوتی ہے تو صرف اس لیے کہ اس پر تنقید کر کے اسے غلط ثابت کیا جا سکے۔ ورنہ اپنی بات اور اپنے نقطہ نظر کو اس میں آخری حق بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔

یہ چیز ان لوگوں میں اپنے نقطہ نظر کے حوالے سے ایک خاص قسم کی جذباتیت پیدا کر دیتی ہے۔ بلکہ ہوتا بھی یہی ہے کہ اس نقطہ نظر کو قبول کرنے والے پہلے مرحلے پر ایسے ہی جذباتی رجحان رکھتے ہیں۔ چنانچہ جہالت اور جذباتیت ملتے ہیں اور فرقہ واریت کو عروج پر پہنچا دیتے ہیں۔ دوسروں کے خلاف مہم جوئی شروع ہو جاتی ہے۔ فتویٰ بازی کا بازار گرم ہو جاتا ہے۔ اپنے ناقص علم اور بودی دلیلوں کو آخری سچ کے طور پر لوگوں کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ جہاں کہیں یہ ناقص علم اور بودی دلیلیں ختم ہو جائیں وہاں جھوٹ بولنے میں بھی کوئی حرج نہیں سمجھا جاتا۔ یوں عوام الناس ایسے کم علم لوگوں کے فریب میں آ کر یہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے تو قلم توڑ دیا ہے۔ تاہم ایسے سطحی علم کے لوگ اپنی جہالت سے اتنے ناواقف نہیں ہوتے۔ انہیں پتہ ہوتا ہے کہ کوئی بھی صاحب علم ان کی جہالت کا پردہ چاک کر کے ان کی حقیقت دنیا کو دکھا سکتا ہے۔ پھر ان کے معتقدین ان سے وہ سوالات کریں گے جن کا کوئی جواب ان کے پاس نہیں ہوگا۔ اس لیے وہ پیروکاروں کو یہ تلقین کرتے ہیں کہ کبھی کسی گمراہ آدمی کی بات نہیں سننا۔ کوئی کتاب کہیں اور سے ملے تو کسی ثقہ عالم (اس سے مراد وہ خود ہی ہوتے ہیں) سے تصدیق کروا کر پڑھنا۔ بلکہ اس کی ضرورت کیا ہے، بس ہماری ہی کتابیں پڑھو اور ہماری تقریریں سنا کرو۔ یہی سامان ہدایت ہے۔ کاش یہ لوگ جانتے کہ یہ تلقین کفار مکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں اپنے لوگوں کو کرتے تھے کہ معاذ اللہ اس مجنون جادوگر کی بات نہ سنو، گمراہ ہو جاؤ گے۔

اس گفتگو کو ایک سچے واقعے پر ختم کر رہا ہوں۔ یہ واقعہ میرے جاننے والے دو بزرگوں کا ہے۔ دونوں معروف اور بڑے عالم ہیں اس لیے ان کا نام نہیں لکھ رہا۔ لیکن امید ہے کہ قارئین اسے پڑھ کر تھوڑا سا مسکرائیں گے ضرور۔ واقعہ یوں ہے کہ ایک بڑے صاحب علم سے وابستہ ایک نوجوان جب کسی دوسرے بڑے عالم کی کتابیں پڑھنے لگے تو انہوں نے اس نوجوان کو

سمجھایا کہ تم اس شخص کی کتابیں نہ پڑھو۔ نوجوان نے پوچھا کہ کیوں نہ پڑھوں۔ جواب ملا تم ابھی چھوٹے ہو گمراہ ہو جاؤ گے۔ نوجوان حاضر جواب تھا۔ فوراً جواب دیا۔ جی میں آپ کے پاس آیا تھا تو اس سے بھی چھوٹا تھا.....

خلاصہ یہ کہ تعصب اور فرقہ واریت پھیلانے والے لوگ یا تو کم علم ہوتے ہیں یا جذبات کے مارے ہوتے ہیں۔ صاحبان علم اور جذبات پر قابو رکھنے والے اہل علم ہمیشہ ایسی چیزوں سے دور رہتے ہیں۔

3۔ غیر علانیہ نبوت

غیر علانیہ نبوت کیا ہوتی ہے، اسے جاننے کے لیے نبوت کی حقیقت سمجھنا ضروری ہے۔ نبوت اس بات کا نام ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک انسان کا انتخاب کر کے اس پر وحی اتارتے ہیں اور اسے اپنا نمائندہ بنا کر دنیا کے سامنے کھڑا کر دیتے ہیں۔ پھر وہ خود نہیں بولتا بلکہ اس کی زبان حق ترجمان سے عالم کا پروردگار کلام فرماتا ہے۔ اسی لیے اس کے کلام میں یقین ہوتا ہے، ادعا ہوتا ہے، اعتماد ہوتا ہے۔ وہ لوگوں تک حق پہنچاتا ہی نہیں ان کے حق و باطل پر ہونے کا فیصلہ بھی سنا دیتا ہے۔ وہ ایک دنیوی چیز کو دین بتاتا ہے تو وہ چیز عین دین بن جاتی ہے۔ وہ ایک عین دینی عمل کو غیر مطلوب قرار دیدیتا ہے تو وہ دین کے دائرہ سے نکل جاتی ہے۔ دین میں اس کی اطاعت لازمی ہے۔ اس کا عمل حجت ہے۔ اس کی بات حتمی ہے۔ اس کی رائے قطعی ہے۔ وہ ماننے والے کو حق سمجھاتا نہیں اسے منواتا بھی ہے۔ اس کا راستہ سچائی کو پانے کا واحد راستہ ہوتا ہے۔ اس کے سوا ہر راستہ گمراہی کا راستہ ہے۔ نبی سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا انکار کفر ہوتا ہے۔ اس کا فیصلہ حق ہوتا ہے۔ اس کا حکم آخری ہوتا ہے۔ یہ صرف اس کا حق ہوتا ہے اور اسی کی ذمہ داری ہے کہ وہ لوگوں کے کفر، ضلالت اور گمراہی کا کھل کر اعلان کر دے۔ اس راہ میں وہ

کسی کی پروا کرتا ہے اور نہ کسی کا خوف کھاتا ہے۔

نبی یہ سب کرتا ہے اور اس لیے کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ براہ راست اسے یہ کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ یہ مقام اور منصب کبھی بھی، کسی صورت میں اور کسی قیمت پر کسی اور کو حاصل نہیں ہوسکتا۔ خاص طور پر ختم نبوت کے بعد اس کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ اب ہر شخص ایک طالب علم ہے۔ وہ دین سیکھے گا اور سمجھائے گا۔ وہ حق سمجھے گا اور پہنچائے گا۔ مگر اس سے اختلاف کیا جاسکتا ہے۔ اس کے خلاف رائے دی جاسکتی ہے۔ اس کے راستے کے سوا دوسرا راستہ اختیار کیا جاسکتا ہے۔

ہمارا رویہ: اپنے ناقص علم کی بنیاد پر دوسروں کا فیصلہ

بدقسمتی سے ہمارے لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ نبی نہیں ہیں۔ وہ خود کو جو بھی سمجھیں مگر بہرحال عام انسان ہیں۔ وہ حق و باطل کا فیصلہ نہیں سنا سکتے۔ وہ دوسروں کے کفر و ضلالت کا فیصلہ نہیں سنا سکتے۔ اس لیے کہ نبی کی طرح انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی عصمت اور کوئی تحفظ حاصل نہیں ہے۔ ان کی رائے غلط ہوسکتی ہے۔ ان کا فہم باطل ہوسکتا ہے۔ ان کی تحقیق غیر مستند ہوسکتی ہے۔ ان کا اجتہاد خطا ہوسکتا ہے۔ ان کا فکر حالات اور زمانے سے متاثر ہوسکتا ہے۔ ان کی سوچ خواہشات و تعصّبات کی اسیر ہوسکتی ہے۔ ان کے جذبات ان کی عقل پر غالب آسکتے ہیں۔ انہیں یہ حق ہے کہ پورے اعتماد اور یقین کے ساتھ اپنی بات لوگوں کے سامنے پیش کریں۔ مگر اسے دین بتانے کے بجائے اپنی رائے کے طور پر پیش کریں۔ نبی کی طرح اسے حق بنا کر پیش نہ کریں۔ انہیں یہ حق ہے کہ جس چیز کو غلط سمجھتے ہیں اسے غلط کہیں۔ مگر ساتھ میں دلیل دیں اور اس بات کو قبول کرنے کے لیے تیار رہیں کہ امکانی طور پر ان کی اپنی بات ہی غلط ہوسکتی ہے۔

پھر سب سے اہم بات جو یاد رکھنی چاہیے کہ اختلاف کرنے کا جو کچھ ان کا حق ہے وہ آراء کے بارے میں ہوسکتا ہے۔ کسی فرد کے بارے میں وہ کوئی رائے نہیں دے سکتے۔ اس لیے کہ

جس شخص کی غلطی انہوں نے دریافت کی ہے، وہ ممکن ہے کہ اخلاص کے ساتھ اس نتیجہ فکر تک پہنچا ہو۔ ایسی صورت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ ہے کہ قیامت کے دن کسی معاملے میں حکم لگانے والا (اگر علم اور اخلاص کے ساتھ یہ کام کرے) تو غلطی کی صورت میں بھی اپنے اخلاص کی بنا پر ایک اجر کا حقدار ہوگا، (بخاری، رقم 7352 مسلم، رقم 1716)۔ ایسے کسی شخص کے متعلق مہم جوئی کرنا، اس کے کفر و ضلالت کے فتوے دینا، اس کی علمی آراء کی بنیاد پر اسے غیر ملکی ایجنٹ ثابت کرنا اس کے ایمان پر براہ راست حملہ ہے اور اس کی سزا نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں بیان کی ہے کہ جو کفر کا الزام لگائے گا وہ یا تو سچا ہے یا پھر خود اپنا ایمان کھو دیتا ہے:

> ''حضرت ابن عمرؓ کا بیان ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب کوئی آدمی اپنے بھائی کو کافر کہتا ہے تو ان دونوں میں سے کوئی ایک اس (کفر کے الزام) کا مستحق بن جاتا ہے۔''، (بخاری، رقم 5753-5752، مسلم، رقم 60)

اس کا سبب بالکل سادہ ہے۔ وہ یہ کہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کی نیت نہیں جان سکتا۔ وہ اس کا دل چیر کر نہیں دیکھ سکتا۔ وہ اس کے ذہن کے اندر نہیں اتر سکتا۔ سب سے بڑھ کر کسی دوسرے کے متعلق رائے قائم کرنے والا خود غلط ہوسکتا ہے۔ وہ نبی نہیں۔ اس پر فرشتے نہیں اترتے۔ وحی نہیں آتی۔ اسے خدائی تحفظ حاصل نہیں۔ اس لیے یہ اس کا حق ہی نہیں کہ کسی دوسرے فرد کے متعلق کوئی رائے قائم کرے۔ رائے ہمیشہ دوسرے کی رائے کے بارے میں دی جاتی ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر اس کی شخصیت، آخرت، ایمان اور نیت کے بارے میں کوئی فیصلہ دینا اللہ تعالیٰ کے غضب کو بھڑکانے کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

بدقسمتی سے ہمارے معاشرے میں یہ سب ہوتا ہے اور یہ کام وہ لوگ کرتے ہیں جن کا علم ایک خاص نقطہ نظر سے منسلک ہونے کی بنا پر بالعموم اپنے نقطہ نظر تک محدود ہوتا ہے۔ وہ بے

چارے ساری زندگی صرف اپنا نقطہ نظر پڑھتے اور سنتے ہیں۔ انہیں اپنے علماء، اپنے لٹریچر، اپنے گروپ اور اپنے فرقے کے علاوہ کسی اور کی خبر نہیں ہوتی۔ وہ اسی محدود علم، خاص دائرے، متعصّبانہ سوچ اور جذبات سے بھرپور کیفیت میں دوسرے کے حق و باطل، صحیح وغلط اور حتیٰ کے کفر وایمان کا فیصلہ کرنے لگتے ہیں۔ کاش یہ لوگ جانتے کہ اس جرم کی سزا کتنی بھیانک ہے۔ مگر یہ لوگ اپنے دائرے میں بند رہتے ہیں اور پورے یقین سے اپنے پیروکاروں کو بتاتے ہیں کہ ہم آخری سچ بیان کررہے ہیں اور ہماری فکر سے اختلاف کسی صورت میں ممکن نہیں ہے۔ پھر وہ آگے بڑھتے ہیں اور اختلاف کرنے والے کے کفر اور پھر اس کے قتل کا فتویٰ دینے لگتے ہیں۔ یوں خدا کی دھرتی ان کے تعصّبات کے سبب ظلم اور فساد سے بھر جاتی ہے اور معصوم لوگوں کی جان مال آبرو برباد ہونے لگتی ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ

عام لوگوں کو یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ انسان جب تک انسان ہے اور سوچ رہا ہے وہ اختلاف کرے گا۔ تمام اختلافات کا حتمی فیصلہ صرف قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کرنے کے مجاز ہیں۔ انسان جب تک دنیا میں ہیں تحقیق کریں گے۔ تخلیق کریں گے۔ رائے قائم کریں گے۔ اس پر نظر ثانی کریں گے۔ یہ صرف نبی ہوتا ہے جو نہ تحقیق کرتا ہے نہ تفکر کرتا اور نہ ذاتی تعصّبات کی بنا پر کوئی رائے قائم کرتا ہے۔ وہ اللہ سے پا کر فیصلہ سناتا ہے۔ کوئی اور یہ کرنے کی کوشش کرے گا تو وہ غیر علانیہ نبوت کرے گا۔ وہ جھوٹی نبوت کرے گا۔ جھوٹی نبوت ہمیشہ فرقہ واریت، تعصب اور فساد پیدا کرتی ہے۔ جبکہ سچی نبوت جو اب صرف خاتم الانبیا والمرسلین محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ہے، ہمیشہ امن، احترام، صلاح اور خیر پیدا کرے گی۔

اس نبوت کا فیصلہ ہے جسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر یوں بیان

فرمایا:

''تمہارے (مسلمانوں کے) خون، اموال اور عزتیں ایک دوسرے پر حرام ہیں، اس دن (عرفہ)، اس شہر (ذوالحجہ) اور اس شہر (مکہ) کی حرمت کی مانند۔ کیا میں نے تم تک بات پہنچادی؟ صحابہ نے (بیک آواز) عرض کیا: جی ہاں۔''

اسی موقع پر آپ نے مزید ارشاد فرمایا:

''دیکھو! میرے بعد دوبارہ کافر نہ بن جانا کہ آپس میں ایک دوسرے کی گردنیں مارتے پھرو۔''

مزید ارشاد فرمایا:

''مسلمان کو گالی دینا فسق ہے اور اس سے قتال کرنا کفر ہے۔''

''مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرا مسلمان محفوظ رہے۔''

''جس نے ہم (مسلمانوں) پر ہتھیار اٹھایا وہ ہم میں سے نہیں۔''

''تم میں سے کوئی اپنے بھائی کی طرف ہتھیار سے اشارہ نہ کرے۔ اسے کیا معلوم کہ شاید شیطان اس کے ہاتھ سے اسے (ہتھیار کو) گرادے (یا چلادے) تو (مسلمانوں کو قتل کرنے کی وجہ سے) وہ جہنم کے ایک گڑھے میں جا گرے۔''

''جب دو مسلمان اپنی تلواریں لے کر ایک دوسرے سے لڑ پڑیں تو وہ دونوں جہنم میں جائیں گے۔ صحابہ نے دریافت کیا کہ اے اللہ کے رسول! ایک تو قاتل ہے (اس لیے جہنم میں جائے گا) لیکن مقتول کا کیا قصور؟ فرمایا: اس لیے کہ اس نے اپنے (مسلمان) ساتھی کے قتل کا ارادہ کیا تھا۔''

''تم میں سے کوئی آدمی جب اپنے بھائی کو کافر کہے تو دونوں میں سے ایک اس کا

مستحق بن جاتا ہے۔ یا تو وہی (سننے والا) کافر ہوتا ہے جیسا کہ کہنے والا اسے کہتا ہے یا پھر (سننے والا) نہیں ہے تو پھر یہ کہنے والے پر پلٹ آئے گا۔''

ہم نے یہ ساری روایات صحیح بخاری سے لی ہیں اور یہ واضح کرتی ہیں کہ لوگوں کا اختلاف ذاتی نوعیت کا ہو یا مذہبی نوعیت کا اسے کسی صورت جان، مال، آبرو اور ایمان و نیت کی طرف نہیں جانا چاہیے۔

یہی وہ اصول ہے جس پر ایک عام آدمی بآسانی یہ فیصلہ کرسکتا ہے کہ مذہبی اختلافات میں غلط رویہ کیا ہوتا ہے۔ جب کبھی کوئی اختلافی مسئلہ سامنے آئے ہمیشہ یہ دیکھیے کہ کہنے والا کس جگہ کھڑا ہے۔ کیا اس نے اپنی رائے کو آخری سچ کے طور پر پیش کیا ہے یا وہ محض اسے ایک رائے سمجھ کر بیان کررہا ہے۔ وہ اپنی رائے بیان کررہا ہے تو اس میں غلطی کا امکان ہوسکتا ہے۔ اور اگر اپنی اس ناقص رائے کو حق سمجھ کر اس کی بنیاد پر دوسروں کے خلاف کفر کے فتوے دے رہا ہے تو وہ غیر علانیہ نبوت کررہا ہے۔ یہ کرنے والے اور اس کو ماننے والے دونوں قیامت کے دن ماخوذ ہوں گے۔

4۔ منافقین اور مستشرقین کا طریقہ

رویے اور سوچ کی اگلی خرابی جو فرقہ واریت اور تعصّبات کے فروغ کا ذریعہ بنتی ہے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن منافقین مدینہ اور مستشرقین کے طریقے کی پیروی ہے۔ منافقین مدینہ کا طریقہ کیا تھا اسے سمجھنا ہے تو واقعہ افک کی مثال سے سمجھئے۔ ایک جہاد (غزوہ بنی مصطلق) سے واپسی پر ہماری ماں سیدہ عائشہؓ کسی وجہ سے لشکر سے پیچھے رہ گئیں۔ ایک صحابی حضرت صفوان بن معطل سلمیؓ جو لشکر کی روانگی کے بعد نگرانی پر معمور تھے وہاں سے گزرے تو آپ کو دیکھ کر صورتحال کا اندازہ کرلیا اور خاموشی سے اپنا اونٹ آپ کو پیش کردیا۔ آپ اونٹ پر سوار ہوئیں

اور یہ دونوں اس طرح لشکر سے جا ملے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اونٹ پر تھیں اور وہ رسی پکڑے ساتھ ساتھ آرہے تھے۔ منافقین نے یہ دیکھا اور ان دونوں پر بہتان لگا کر ایک عظیم فتنہ برپا کردیا۔ منافقین نے اتنی زبردست پروپیگنڈہ مہم چلائی کہ اچھے اچھے لوگ جن میں حضرت حسان بن ثابتؓ جیسے صحابی رسول بھی شامل ہیں، اس کا شکار ہوگئے۔ آخر کار اللہ تعالیٰ نے خود ام المومنین کی برات قرآن مجید میں نازل کرکے اس فتنے کا خاتمہ فرمایا۔

اس واقعے سے جو طریقہ واردات ہمارے سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ جب کوئی معاملہ ایسا سامنے آئے جس کی مثبت تاویل کرنا ممکن ہو اور جیسا کہ اس معاملے میں کی جاسکتی تھی کہ نبی کی اہلیہ جن سے وہ سب سے بڑھ کر راضی ہوں ایسا کام کیسے کرسکتی تھیں اور نبی کا ایک جانثار اپنے آقا کی عزت پر ڈاکہ ڈال کر کیسے صاحب ایمان رہ سکتا تھا اور یہ کرنے کے بعد پورے اعتماد سے دونوں ایک ساتھ علانیہ لشکر میں کیسے داخل ہوسکتے ہیں جبکہ ایسے کام ہمیشہ چھپ کر کیے جاتے ہیں۔ ایسے تمام مثبت امکانات کو چھوڑ کر منفی ترین امکان کو لیا جائے چاہے وہ کتنا ہی بعید ہو اور اسے حقیقت بنا کر پیش کردیا جائے۔ لوگوں کی نیت، ایمان اور آبرو پر حملہ کیا جائے۔ حسن ظن کو بالائے طاق رکھ کر بدگمانی سے معاملے کا آغاز کیا جائے۔ موقع محل، سیرت و شخصیت، عرف و شہرت سب کو نظر انداز کرکے بدترین بہتان کو بھی باآسانی لگا دیا جائے۔

اس طریقہ واردات کو اگر نقطہ عروج پر کسی نے پہنچایا ہے تو وہ مستشرقین کا گروہ ہے۔ مستشرقین ان مغربی اہل علم کو کہتے ہیں جو مشرقی علوم اور مشرقی تہذیب کے ماہر ہوتے ہیں۔ تاہم ان کی ایک بڑی تعداد کا موضوع اسلام، قرآن اور پیغمبر اسلام کی شخصیت رہی ہے۔ اس میں سے بھی زیادہ تر لوگوں کا کام یہ رہا ہے کہ وہ اسلام اور پیغمبر اسلام کی شخصیت پر ہر ممکنہ حملے کرکے اسے لوگوں کی نگاہوں میں غیر معتبر بنانے کی کوشش کریں۔

دوربین اور خوردبین

ان مستشرقین کے طریقہ واردات کے بارے میں سب سے خوبصورت تبصرہ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ نے یوں کیا ہے کہ یہ لوگ خوردبین سے دیکھتے اور دوسرے کو دوربین سے دکھاتے ہیں۔ مطلب یہ کہ ان کا مطمع نظر اسلام اور پیغمبر اسلام میں صرف خامیاں ڈھونڈنا ہوتا ہے۔ اس مقصد کے لیے وہ چھوٹی چھوٹی چیزوں کو اٹھاتے اور دوسروں کو یہ چیزیں بہت بڑی اور اہم بنا کر دکھاتے ہیں۔

اس کی ایک بڑی مثال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شادیاں ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے 25 سال تک کی عمر، مکہ کے شہر میں جہاں زنا کرنا کوئی مسئلہ تھا نہ کوئی جرم، انتہائی پاکدامنی کے ساتھ گزاری۔ پھر ایک شریف اور باعزت خاتون حضرت خدیجہؓ سے نکاح کیا جو عمر میں بڑی تھیں اور بڑی وفاداری اور محبت سے ان کے ساتھ پچیس سال گزارے۔ پھر یہ سب عرب کے اس قبائلی نظام میں رہ کر کیا جہاں دوسری شادی کوئی مسئلہ تھی نہ اس میں کوئی رکاوٹ حائل تھی۔ چالیس سال کی عمر میں پیغمبر بننے کے بعد آپ کی حیثیت اتنی غیر معمولی ہو چکی تھی کہ ایک اشارے پر ماننے والے اپنی بہنوں اور بیٹیوں کے نکاح کے لیے حاضر تھے۔ مگر آپ نے پوری جوانی نکال دی اور سیدہ کی وفات تک کوئی اور شادی نہ کی۔ ان سارے حقائق کو نظر انداز کر کے مستشرقین محض شادیوں کی تعداد کو بنیاد بنا کر ایسی فتنہ انگیزی کرتے ہیں کہ غیر مسلموں کو تو چھوڑیے خود مسلمانوں کا ایمان متزلزل ہو جاتا ہے۔

یہی فتنہ پردازی سیدہ عائشہؓ سے شادی اور سیدہ زینبؓ کے نکاح کے حوالے سے کی جاتی ہے۔ اس معاملے میں جو غلاظت ان کے قلم اور زبان سے نکلتی ہے اسے ایک مومن کا قلم نقل کرنے کی ہمت بھی نہیں رکھتا۔ یہی معاملہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جہاد کے حوالے سے

کیا جاتا ہے۔ مثلاً بنو قریظہ کو جنگ خندق کے موقع پر بدعہدی اور دشمنوں سے ساز باز کے جرم میں یہ سزا دی گئی کہ ان کے تمام مردوں کو قتل اور تمام عورتوں بچوں کو لونڈی غلام بنا لیا گیا۔ یہ فیصلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نہیں تھا بلکہ ان کے حلیف حضرت سعد بن معاذؓ کا تھا جنہوں نے یہودیوں کی اپنی شریعت یعنی تورات کے قانون کے مطابق یہ فیصلہ کیا تھا۔ مگر اس واقعے کے موقع محل اور پس منظر کو الگ کر کے مستشرقین اس کو خوب اچھالتے اور نبی رحمت کے متعلق ایسا پروپیگنڈا کرتے ہیں کہ عقل حیران ہو جاتی ہے۔

یہ ہم نے ایک دو نمایاں مثالیں دی ہیں وگرنہ ان لوگوں نے اس طریقہ واردات کو استعمال کر کے اتنا مکروہ پروپیگنڈہ پھیلایا ہے اور ایسی مہم جوئی کی ہے کہ حد نہیں۔

متعصب لوگوں کا طریقہ

منافقین اور مستشرقین یہود کا یہی وہ طریقہ واردات ہے جو فرقہ واریت اور گروہی تعصب پھیلانے والے لوگ اختیار کرتے ہیں۔ بظاہر یہ اللہ اور رسول کا نام لیتے اور حمیت دین کے نام پر کھڑے ہوتے ہیں، مگر ان کا طریقہ ٹھیک یہی ہوتا ہے۔ کسی عالم کی پوری زندگی اور شخصیت کو نظر انداز کر کے اس کی تحریر کا ایک جز لیا، سیاق سباق سے کاٹا اور کفر کا فتویٰ ایجاد کر دیا۔ اپنے نقطہ نظر اور مفروضوں کو حق کا معیار سمجھا اور سامنے والے کی بات کو عین باطل قرار دے دیا۔ جھوٹ اور دروغ گوئی کا سہارا لیا اور کسی بھی فرد، گروہ اور کتاب کے خلاف ایسی بھرپور مہم چلائی کہ لوگ اس کا نام سن کر کانوں پر ہاتھ رکھنے پر مجبور ہو جائیں۔ کسی بات یا واقعے کو لیا موقع محل اور پس منظر کو چھپا لیا اور اپنے مخاطب اور ماننے والے کو یہ باور کرا دیا کہ یہ بات کرنے والا گمراہ ہے اور گمراہی پھیلا رہا ہے۔

یہ طریقہ واردات سیاق وسباق، موقع محل اور پس منظر کو نظر انداز کرنے اور علمی خیانت کے دیگر

طریقوں ہی سے عبارت نہیں بلکہ الزام، بہتان، جھوٹ، دروغ گوئی، دھوکہ دہی، تجسس، بدگمانی اور دین وایمان اور نیت پر براہ راست حملوں جیسے شدید ترین ایمانی اور اخلاقی جرائم پر مشتمل ہوتا ہے۔

ایسے لوگوں کی نیت اور مقصد اگر دین کی حفاظت ہوتا تو کبھی یہ ممکن نہیں تھا کہ یہ لوگ مسلمہ دینی اور اخلاقی حدود کو پامال کر کے دین کا دفاع کرتے۔ ان لوگوں کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ یہ خدا کے دین کی بات کرتے ہیں مگر دین ہی کی بنیادی حدود کو پامال کرتے ہیں۔ یہ نبی کا نام لیتے ہیں مگر نبی کے طریقے اور ہدایات کو بھول جاتے ہیں۔ یہ عشق رسول کا دم بھرتے ہیں، مگر اخلاق رسول سے آخری درجہ میں عاری ہوتے ہیں۔ یہ عدل اجتماعی کا نعرہ لگاتے ہیں، مگر قلم ہاتھ میں لے کر عدل نہیں کرتے۔ یہ دن رات دوسروں کو درس قرآن دیتے ہیں اور قرآن کی یہ بنیادی ہدایت بھول جاتے ہیں کہ کسی قوم کی دشمنی تمھیں ناانصافی پر آمادہ نہ کردے۔ اس لیے ہمیشہ عدل کرو، (مائدہ 8:5)۔ یہ اپنے بنائے ہوئے آئینے میں دوسروں کی تصویر دیکھتے اور دکھاتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ ان کا آئینہ حقیقت کے بجائے ان کے تعصّبات اور جذبات کا اسیر ہوسکتا ہے۔ یہ مذہبی سیادت کے منصب پر فائز ہوکر اس بات سے نہیں ڈرتے کہ ان کی پرسش دوسروں سے زیادہ ہوگی۔ یہ نہیں سوچتے کہ جو دھیلے کے امین نہیں پروردگار انہیں زمین کا خزانہ کیسے دے سکتا ہے۔ جو قلم ہاتھ میں لے کر عدل نہ کرسکے ان کے ہاتھ میں زمین کا اقتدار کیسے دیا جاسکتا ہے۔

بدقسمتی سے مستشرقین کا یہ طریقہ قول سدید (احزاب 33:70)، اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور درست بات کرو) اور ہر حال میں عدل، (مائدہ 8:5) کے قرآنی احکام کی خلاف ورزی ہے مگر آج سب سے بڑھ کر مسلمان ہی اس طریقے کے علمبردار ہو چکے ہیں اور پروپیگنڈہ کی ایسی مہمیں چلاتے ہیں کہ یہودیوں کو بھی شرم آجائے۔

5۔ غیر روایتی کام کی مخالفت

فرقہ واریت اور گروہی تعصّبات کا ایک سبب یہ ہوتا ہے کہ لوگ اپنے سامنے کسی ایسے عالم یا محقق کو دیکھتے ہیں جس کا کام انتہائی غیر معمولی مگر غیر روایتی ہوتا ہے۔ ایسے لوگ بارہا ایک ایسے نئے کام کا آغاز کرتے اور ایک ایسا نیا طریقہ اختیار کرتے ہیں جو معاصرین کے وہم وخیال سے بلند ہوتا ہے۔ یہ غیر روایتی، مختلف اور منفرد چیز خود تعصّبات کو بھڑکا دیتی ہے۔ ایسے اہل علم کے متعلق میں مولانا ابوالحسن علی ندوی کا ایک اقتباس یہاں نقل کررہا ہوں جو انہوں نے علامہ ابن تیمیہ کے حوالے سے لکھا تھا۔ اسے پڑھیں اور دیکھیں کہ مولانا نے کس خوبی سے اُس مخالفت کی وجوہات کا تجزیہ کیا ہے جس کا سامنا ابن تیمیہ کو اس دور کی روایات سے ہٹنے کی بنا پر کرنا پڑا۔ یہ وجوہات کسی فکر، فلسفہ اور نقطہ نظر کے مخالفین کی مخالفت کو سمجھنے کے لیے بہترین نمونہ ہیں۔ ان کو سمجھنے کے بعد فرقہ واریت اور مذہبی اختلافات کو سمجھنا بہت آسان ہوجاتا ہے۔

میں یہاں یہ بتاتا چلوں کہ مولانا ابوالحسن علی ندوی ان بزرگوں میں سے ہیں جنھیں عالم عرب وعجم میں بہت عزت اور احترام کے ساتھ دیکھا جاتا ہے۔ ان کی علمی حیثیت یہ ہے کہ بیسویں صدی میں جو پانچ سات بزرگ عالم اسلام میں چوٹی کے علما شمار کیے جاتے تھے مولانا ان میں سے ایک تھے۔ مولانا سے ذاتی طور پر مجھے بڑی عقیدت اور محبت ہے اور میں نے ان سے علمی طور پر بہت استفادہ کیا ہے۔ اب ذرا مولانا کا درج ذیل اقتباس ملاحظہ فرمایئے جو ذرا طویل ہے، مگر زبان وبیان کے اعتبار سے کمال کی چیز ہے۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی کا اقتباس

''ان غیر معمولی علمی وذہنی کمالات اور مسلّم اخلاص وتدیّن کے ساتھ ایک سلیم الطبع انسان کے دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان (ابن تیمیہ) کے معاصرین اور بعض متاخرین نے کیوں

اس شدت سے ان کی مخالفت کی، اوران کی ذات ان کے زمانہ سے لے کراس وقت تک کیوں موضوعِ بحث بنی ہوئی ہے؟ ایسے جامع کمالات کے انسان کی عظمت وقبولیت پرتو سب کا اتفاق ہونا چاہیے! یہ سوال حق بجانب ہے، اوراس کا مستحق ہے کہ ان کی سیرت اوران کی معاصر تاریخ کی روشنی میں سنجیدگی سے اس کا جواب دیا جائے۔

۱۔اولاً تو یہی ان کی عظمت کی دلیل ہے کہ ان کی ذات کے بارے میں شروع سے دوفریق بنے ہوئے ہیں، اوران میں حریفانہ کشمکش جاری ہے، تاریخ میں جو شخصیتیں بہت ممتاز، غیر معمولی اورخارق عادت کمالات کی حامل ہیں، ان کے بارے میں ہمیشہ سے یہی طرزِ عمل رہا ہے کہ ایک گروہ ان کے معتقدین کا بن گیا ہے، جوان کی تعریف میں غلواور مبالغہ سے کام لیتا ہے، دوسرا گروہ ناقدین ومخالفین کا ہے، جوان کی تنقید بلکہ تنقیص میں انتہا پسند اور غالی نظر آتا ہے، عظیم الشان اور غیر معمولی شخصیتوں کے بارے میں تاریخ کا یہ ایک ایسا مسلسل اور متواتر تجربہ ہے کہ بعض فلاسفہ تاریخ اور نفسیات ''عظمت وعبقریت'' کے مبصرین نے اس کو قاعدہ کلیہ اور شرط عظمت وعبقریت قرار دیا ہے۔

۲۔ابن تیمیہ کی ذات میں ان کے معاصرین کے لیے سب سے بڑا ابتلاء اورامتحان یہ تھا کہ وہ اس زمانہ اوراس نسل کی عام ذہنی وعلمی سطح سے بلند تھے، اپنے زمانہ کی سطح سے بلند ہونا ایک نعمتِ خداداد اور ایک قابلِ رشک کمال ہے، مگراس کمال کی صاحبِ کمال کو بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے، وہ صاحبِ کمال اپنے معاصرین کی طرف سے ایک مسلسل ابتلاء اور آزمائش میں رہتا ہے، اور وہ معاصرین اس صاحبِ کمال سے زندگی بھر ایک مصیبت اور زحمت میں مبتلا رہتے ہیں، وہ اس کی تازگیٔ فکر، بلندیٔ نظر، قوتِ اجتہاد کا ساتھ نہیں دے سکتے، اوراس کے آفاقِ علم وفکر تک ان کی رسائی نہیں ہوتی، اوروہ ان کے معین ومحدود اصطلاحات اور مدرسی حدود میں مقید نہیں رہ سکتا، وہ علم ونظر کی

آزاد فضاؤں اور قرآن وحدیث کے بلند اور وسیع آفاق میں آزادانہ پرواز کرتا ہے، ان کا مبلغ علم متقدمین اوراہلِ درس کی کتابوں کا سمجھ لینا ہوتا ہے، وہ واضح علوم اور بہت سے فنون کا مجتہد ومجدد ہوتا ہے، غرض مدارک اوراستعدادوں کا یہ تفاوت اس کے اوراس کے مخلص معاصرین کے درمیان ایسی کشمکش پیدا کردیتا ہے کہ یہ گتھی کبھی سلجھتی نہیں، اوروہ کبھی اپنے معاصرین کو مطمئن نہیں کرسکتا، ہر زمانہ کے صاحبِ کمال اور مجتہد الفن علما نے اس کی شکایت کی ہے کہ ان کی تحقیقات اور علوم و مضامین ان کے زمانہ کی علمی ونصابی سطح سے بلند اوران اہلِ علم کی دسترس سے باہر ہیں، جن کی پروازِ فکر متداول کتابوں سے آگے نہیں، اور یہی بہت سے اہلِ علم کی مخالفت کا سبب اور محرک ہے۔

۳۔مخالفین کا ایک گروہ اس بنا پر مخالف تھا کہ وہ اپنی غیر معمولی ذہانت وعلم، اپنی شخصیت کی دلآویزی اور بلندی کی وجہ سے عوام وخواص میں مقبول اور حکومت کے اشخاص پر حاوی ہوتے جارہے ہیں، اوران کے علم وتقریر کے سامنے کسی کا چراغ نہیں جلتا، وہ جہاں رہتے ہیں، سب پر چھا جاتے ہیں، درس دیتے ہیں تو درس کی دوسری محفلیں بے رونق ہوجاتی ہیں، تقریر کرتے ہیں تو علم کا دریا امنڈتا نظر آتا ہے، ذہبی نے اس معنی خیز فقرہ میں دلوں کی چھپی ہوئی بات کو آشکارا کردیا ہے:

غير انه يغترف من بحر و غيره من الائمة يغترفون من السواقی۔

''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ تو سمندر سے پانی لیتے ہیں، اور دوسرے اکابر علما چھوٹی چھوٹی نہروں اور نالیوں سے پانی لیتے ہیں۔''

ہر زمانہ کے علما بہرحال بشر تھے، اورانسانوں ہی کا دل ودماغ اور انسانی احساسات رکھتے تھے، اس لیے کوئی تعجب کی بات نہیں کہ بہت سے لوگوں کے لیے ان کی مخالفت کا موجب یہی احساس کمتری اور انسانی طبیعت کی قدیم کمزوری تھی، جس سے بچنا بڑا مشکل کام ہے، امام

ابوحنیفہؒ سے شدید اختلاف وعناد رکھنے کے اسباب کا ذکر کرتے ہوئے مؤرخین نے یہ شعر لکھا ہے جو ہر زمانہ پر صادق ہے:

حسدو الفتی اذ لم ینالو لواسعیه فالناس اعداء له و خصوم

۴۔ بہت سے معاصرین کی مخالفت کا ایک قدرتی سبب شیخ الاسلام کی ایک مزاجی خصوصیت بھی تھی، جو بہت سے ان اہلِ کمال میں ہوتی ہے جو غیر معمولی طور پر ذہین، وسیع النظر اور کثیر المعلومات ہوتے ہیں، یعنی طبیعت کی تیزی اور ذکاوتِ حس، جو بعض اوقات ان کو اپنے بعض حریفوں کی سخت تنقید اور ان کے جہل اور غباوت اور قلتِ علم کے اظہار پر آمادہ کر دیتی ہے، اور شدتِ تأثر میں ان کی زبان سے بعض ایسے الفاظ نکل جاتے ہیں جس سے ان کے اہلِ علم معاصرین اور ان کے معتقدین وتلامذہ کی دل شکنی اور تحقیر ہوتی ہے، اور ان کے دل میں مستقل نفرت وعناد کے بیج پڑ جاتے ہیں، جو علمی وفقہی اصطلاحات، کفر وضلال کے فتوے اور مسلسل مخالفتوں اور ریشہ دوانیوں کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں۔

۵۔ مخالفت کا ایک سبب ان کی بعض وہ تحقیقات اور ترجیحات ہیں، جن میں وہ متفرد اور مذاہب مشہورہ اور ائمہ اربعہ سے بھی بعض اوقات الگ نظر آتے ہیں، جن لوگوں کی فقہ وخلاف کی تاریخ اور ائمہ ومجتہدین کے اقوال ومسائل پر وسیع نظر ہے ان کے لیے تو یہ "تفردات" کوئی وحشت کی چیز اور ابن تیمیہ کے فضل و کمال کے انکار کا موجب نہیں، وہ جانتے ہیں کہ اگر ائمہ مشہورین اور اولیاے مقبولین کے تفردات اور مسائلِ غریبہ جمع کر دیے جائیں تو یہ تفردات بہت ہلکے اور معمولی نظر آنے لگیں، اور ان لوگوں کا حسنِ اعتقاد جو "تفرد" کو مقبولیت اور حقانیت کے منافی سمجھتے ہیں، اور ان کے لیے عظمت وولایت کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ اس کا کوئی قول اور کوئی تحقیق مشہور تحقیقات کے خلاف نہ ہو، متزلزل میں پڑ جائے گا۔

۶۔ ان کی مخالفت کا ایک قوی سبب یہ تھا کہ انھوں نے اس طرز کلام اور صفات ومتشابہات کی

تاویل کے اس طریقہ کی مخالفت کی جو 'عقیدہ اشعریہ' بلکہ عقیدۂ اہل سنت کے نام سے موسوم تھا .....اس وقت تمام عالمِ اسلام پر اشعری العقیدہ علما ومتکلمین کا اثر تھا، امام ابن تیمیہؒ کا یہ اختلاف جو خالص علمی بنیادوں پر تھا، ایک بدعت اور "یتبع غیر سبیل المؤمنین" کا مترادف سمجھا گیا۔.....

۷۔ مخالفت کا ایک سبب شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کی مخالفت ہے، بہت سے لوگوں کے نزدیک خصوصاً جو تصوف کا مذاق رکھتے ہیں، ابن تیمیہ کا یہ جرم ناقابلِ معافی ہے، اور ان کے تمام محاسن وکمالات پر پانی پھیر دیتا ہے کہ انھوں نے شیخِ اکبر کے مشہور آراء وتحقیقات اور ان کے مسلک وحدۃ الوجود کی پرزور تردید کی ہے، اور وہ ان کے مخالفین میں سے ہیں۔.....

۸۔ ایک گروہ کو ان کی طرف سے شدید غلط فہمیاں اور مغالطے تھے۔ بعض غیر محتاط ومتعصب مصنفین نے ان کی طرف ایسے اقوال کی نسبت کی تھی، جو عام عقیدۂ اہلِ سنت اور جمہور کے مسلک کے مطابق موجبِ کفر ہیں، اور بعض ایسے اقوال ان کی طرف منسوب کیے گئے جن سے مقامِ رسالت میں سوءِ ادب اور تنقیص کا پہلو نکلتا ہے۔ (اعاذنا اللہ وجمیع المسلمین منہ) یہ معاملہ تنہا ابن تیمیہ کے ساتھ نہیں کیا گیا، دوسرے اکابر امت بھی معاندین کی اس سازش کا شکار ہوئے ہیں، ان کی طرف نہ صرف ان اقوال وعقائد کی نسبت کی گئی، جن سے وہ بالکل بری تھے، بلکہ ان کی کتابوں میں ایسے مضامین شامل کیے گئے جو موجبِ کفر وضلال تھے، ایک قدم اس سے بڑھ کر مستقل کتابیں (جو کفریہ اقوال پر مشتمل تھیں) تصنیف کر کے ان کی طرف منسوب کر دی گئیں، اور ان کی وسیع پیمانے پر اشاعت کی گئی۔" (تاریخ دعوت وعزیمت، جلد دوم 158-147)

6۔ اسلاف کا طریقہ

یہ گفتگو اب خاتمہ پر ہے، مگر ضروری محسوس ہوتا ہے کہ اس موقع پر یہ بیان کر دیا جائے کہ اختلافات کے معاملے میں اسلاف کا رویہ کیا تھا۔ ہمارے ہاں اسلاف کا نام بہت لیا جاتا ہے۔

بلکہ مشاہدہ یہ ہے کہ کسی اختلافی مسئلے میں دوسروں کو مطعون کرنے کے لیے اسلاف سے اختلاف ہی کے نام کو استعمال کیا جاتا ہے۔ مگر اختلاف رائے پیش آنے کی صورت میں خود اسلاف کا رویہ کیا تھا، یہ کم ہی بیان کیا جاتا ہے۔

ہمارے نزدیک اس سلسلے کی سب سے پہلی اور بنیادی بات اس حقیقت کو سمجھنا ہے کہ اسلاف اپنے کسی کام کو حرف آخر نہیں کہا کرتے تھے۔ نہ انہوں نے کبھی لوگوں کو اس بات سے منع کیا کہ وہ دلیل کی بنیاد پر ان سے اختلاف نہ کریں۔ اس کو سادہ ترین مثال سے یوں سمجھیں کہ اگر ہمارے اسلاف کا یہ طریقہ ہوتا تو امام ابوحنیفہؒ کے بعد فقہ میں کوئی کام نہیں ہوسکتا نہ امام بخاریؒ کے بعد حدیث کی کوئی کتاب مرتب کی جاسکتی ہے۔ امام ابوحنیفہ کے بعد اگر کوئی کام ہوا تو ظاہر ہے کہ اس کا ایک بڑا حصہ ان دیگر ائمہ فقہ کا ہے جو ان سے قدرے مختلف اصول رکھتے تھے۔ یہی معاملہ علم حدیث کا ہے جہاں دیگر محدثین کا زاویہ نظر اور قبولیت حدیث کا معیار امام بخاری سے مختلف تھا۔ یہ اختلاف نہ ہوتا تو حدیث اور فقہ کا ہمارا ذخیرہ بہت محدود ہوتا۔ یہی معاملہ دیگر علوم کا ہے۔ مگر اس اختلاف کی برکت سے ہمارا علم وسیع ہوگیا۔

ائمہ فن میں اس اختلاف کا سادہ سبب یہ تھا کہ یہ اپنے کام کو ایک علمی کام سمجھتے تھے، کبھی حق قرار نہیں دیتے تھے۔ اس معاملے میں امام شافعی کے اس قول کو حرف آخر کی حیثیت حاصل ہے:

رای صواب یحتمل الخطا ورای غیری خطا یحتمل الصواب

یعنی میری رائے درست ہے گرچہ غلطی کا امکان رکھتی ہے اور دوسرے شخص کی بات غلط ہے گرچہ اس کے درست ہونے کا احتمال ہے۔

یہاں یہ بھی ذہن میں رہنا چاہیے کہ بعض اوقات مسئلہ صحیح اور غلط کا ہوتا ہی نہیں۔ ایک ہی معاملے کو دیکھنے کے ایک سے زیادہ زاویے ہوسکتے ہیں۔ بعض اوقات معروضی حالات کی بنا پر

ایک بات زیادہ درست ہوسکتی ہے اور دوسرے حالات میں دوسری رائے زیادہ قابل عمل ہوجاتی ہے۔ بعض اوقات تحقیق، علم اور استعداد نتائج فکر میں فرق پیدا کردیتے ہیں۔ بعض اوقات اہل علم کا مزاج اور افتاد طبع بھی رائے کے فرق کا سبب بن جاتا ہے۔ غرض فہم اور تحقیق کی صلاحیت، ذوق اور طبیعت، زاویہ نظر و فکر، علم و استعداد اور خارجی حالات مل کر رائے کے اختلاف کا سبب بن جاتے ہیں۔ شاگرد استاد سے اختلاف کردیتا ہے اور اگلے والے پچھلے والوں کے برعکس ایک رائے قائم کرلیتے ہیں۔

ہمارے اسلاف ان ساری چیزوں کو سمجھتے تھے اور اسی بنیاد پر دوسروں سے اختلاف کرتے اور دوسروں کو اختلاف کرنے کی اجازت دیتے تھے۔ بڑے صاحبان علم نے اس میں کبھی توحش اور پریشانی کی بات نہیں سمجھی۔ کیونکہ یہ سارا اختلاف فروع میں ہورہا ہوتا ہے اصول میں نہیں۔ اس میں ابتدائی صدیوں کی بھی کوئی قید نہیں۔ امام ابن تیمیہ کی مثال اوپر گزری ہے جو قرون اولیٰ کے بہت بعد پیدا ہونے والے بہت بڑے عالم ہیں۔ جیسا کہ مولانا ندوی نے اوپر فرمایا کہ انہوں بہت سے معاملات میں اگلوں سے اختلاف کیا اور بڑے ائمہ کے برعکس اپنی ایک منفرد رائے قائم کی۔ اور آج بھی ان کی آراء کو ماننے والے بھی کم نہیں ہیں۔

چنانچہ آج بھی جتنے مسائل ہیں وہ دراصل اسلاف کے اس اصول کو چھوڑ دینے کا نتیجہ ہے جس کے تحت ہمارے ائمہ اور اسلاف نہ صرف اختلاف کرنے کی اجازت دیتے رہے بلکہ اپنی غلطی کا امکان بھی ہمیشہ تسلیم کرتے رہے۔ جیسا کہ امام شافعی نے فرمایا:

رای صواب یحتمل الخطا ورای غیری خطا یحتمل الصواب

''یعنی میری رائے درست ہے گرچہ غلطی کا امکان رکھتی ہے اور دوسرے شخص کی بات غلط ہے گرچہ اس کے درست ہونے کا احتمال ہے۔''

7۔ جھوٹے پروپیگنڈے کو بلاتحقیق پھیلانا

ان تمام وجوہات کے ساتھ کچھ اور اخلاقی کمزوریاں بھی اس گروہی تعصب اور فرقہ واریت میں اضافہ کا سبب بن جاتی ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ الزام و بہتان تراشنے والا کوئی ایک شخص ہوتا ہے، مگر باقی لوگ کارِ ثواب سمجھ کر اس کو پھیلانے لگتے ہیں۔ اوپر واقعہ افک کی جو تفصیلات بیان ہوئیں ان کے بعد اللہ تعالیٰ نے سیدہ عائشہؓ کی جو براءت سورہ نور (24) آیت 11 تا 18 میں نازل کی اس میں تمام کمزوریوں کی طرف خصوصیت کے ساتھ توجہ دلائی گئی جو معاشرے میں الزام و بہتان کی سوچ عام کرتی ہیں۔ یہ درج ذیل ہیں۔

1) مسلمانوں کو ایک دوسرے کے متعلق نیک ہی گمان کرنے چاہیے۔ کیونکہ الزام و بہتان کی کسی مہم میں ایک طرف مہم جوئی کرنے والے لوگ ہوتے ہیں اور دوسری طرف اس مہم کا نشانہ بننے والا شخص۔ ایسے میں عام لوگوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ ہمیشہ حسن ظن سے کام لیں۔ وہ ایسی کسی بات کو سنتے ہی کہہ دیں کہ یہ بہتان ہے اور ہمیں حق نہیں کہ ہم ایسی کوئی بات زبان پر لائیں۔ اس کے برعکس بغیر علم و تحقیق کے اس بات کو آگے پھیلانا، خود ایک منفی رائے قائم کرنا، دوسروں کی رائے سازی کرنا ایک بہت بڑی بات اور اللہ کے عذاب کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ حدیث مبارکہ میں اس عمل کو جھوٹ کہا گیا ہے۔ ارشاد نبوی ہے:

''کسی شخص کے جھوٹا ہونے کے لیے یہ کافی ہے کہ وہ ہر سنی سنائی بات بیان کرنے لگے۔''

یہ روایت امام مسلم اپنے صحیح کے مقدمے میں لائے ہیں اور دیگر محدثین مثلاً امام البانی نے اس کو صحیح کہا ہے۔ (صحیح الجامع، حدیث رقم 4482)۔ اسی مفہوم کی ایک صحیح روایت یہ ہے کہ کسی شخص کے گنہ گار ہونے کے لیے یہ کافی ہے کہ وہ ہر سنی سنائی بات بیان کرنے لگے۔ (السلسلة الصحيحة :2025)۔

2) سیدہؓ کے معاملے میں بہتان تو زنا کا لگایا گیا تھا، مگر تردید کرتے وقت قرآن مجید نے زنا

کا لفظ استعمال ہی نہیں کیا۔ اس کا ایک سبب یہ ہے کہ قرآن مجید الزام و بہتان کے اس رویے پر تنقید کو صرف زنا کے الزام کی حد تک محدود نہیں کرنا چاہتا بلکہ اس کے پیش نظر یہ بات ہے کہ کسی مسلمان پر اگر کسی اور پہلو سے بھی کوئی سنگین الزام لگایا جائے، جیسا کہ مذہبی اختلافات میں آج کل مسلمانوں کی نیت اور ان کے ایمان پر براہ راست حملے کر کے انہیں کافر اور گمراہ قرار دیا جاتا ہے، اس رویے کی بھی حوصلہ شکنی کی جائے۔ کسی کی عزت پر حملہ کرنا بڑا سنگین جرم ہے، مگر اس کے ایمان اور نیت کو ہدف بنانا اس سے بھی کہیں زیادہ سنگین جرم ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ سلم نے اس چیز کو سمجھا اور اس کو بیان کیا ہے۔ چنانچہ بخاری و مسلم میں اس مفہوم کی متعدد روایات ہمیں ملتی ہیں جس میں واضح کیا گیا ہے کہ کسی مسلمان کو کافر کہنا خود اپنے کفر کا سبب بن جاتا ہے۔

3) جو لوگ اس وقت الزام لگا رہے تھے ان سے کہا گیا کہ وہ چار گواہ لے کر آئیں۔ یہ بات عقل عام سے سمجھی جا سکتی ہے کہ زنا چھپ کر کیا جاتا ہے چار لوگوں کے سامنے نہیں۔ چنانچہ بہت سے لوگ اس بنا پر قرآن کا مذاق بھی اڑاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے شرط ہی وہ رکھی ہے جو کبھی پوری نہیں کی جا سکتی۔ مگر درحقیقت الزام کو ثابت کرنے کے لیے اتنی سخت ترین شرط لگانے کا مقصد ہی یہی ہے کہ معاشرے میں الزام لگانے کی سوچ کو ختم کیا جا سکے۔ جب تک کہ ناقابل تردید ثبوت میسر نہ ہوں، کسی بھی شخص کے خلاف کسی پہلو سے زبان نہ کھولی جائے۔

چار گواہ چونکہ عدالت ہی میں پیش ہو سکتے ہیں جہاں عدالت ہر دو فریق کا فیصلہ اور گواہی طلب کر کے انصاف کے مطابق حکم لگاتی ہے، اس سے عام لوگوں کے لیے مزید یہ ہدایت نکلتی ہے کہ ایسے معاملات میں وہ بھی انصاف سے کام لیں۔ انصاف کے لیے شرط ہے کہ دونوں فریقوں کا موقف سنا جائے اور پھر کسی نتیجے پر پہنچا جائے۔ کسی ایک فریق کے یکطرفہ الزامات سن کر ان الزامات کو آگے بڑھانا ایک بدترین جرم ہے جس کی روز قیامت جواب دہی کرنی ہوگی۔

شیطان یا فرشتہ

عام لوگوں کے اس طرح کی چیزوں میں پڑنے کا ایک باعث ہمارے معاشرے کی یہ نفسیاتی کمزوری ہے کہ ہم جب کسی انسان کے متعلق رائے قائم کرتے ہیں تو اسے شیطان یا فرشتے میں سے کسی ایک انتہا پر ضرور پہنچا دیتے ہیں۔ ہم جس عالم سے متاثر ہو جائیں اسے تقدس اور عظمت کے اس مقام پر پہنچا دیتے ہیں جہاں ہم برائے بحث یہ تو مان سکتے ہیں کہ ہمارا عالم غلطی کر سکتا ہے، مگر ہمارا پورا یقین ہوتا ہے کہ اس نے کوئی غلطی نہیں کی ہے۔

دوسری طرف جس شخص کے خلاف ہمارا عالم اور ہمارا فرقہ محاذ کھول دے، ہمیں یقین ہو جاتا ہے کہ یہ ایک شیطان ہے جس میں کسی خوبی کا پایا جانا ممکن نہیں ہے۔ اس کا مکمل بائیکاٹ کرنا، اس کی بات سننے اور پڑھنے سے انکار کر دینا، اس کی کسی بھی اچھائی کا اعتراف کرنا ہمارے لیے ناممکن ہو جاتا ہے۔ ایسا شخص توحید پر بھی بات کرے گا تو ہم اس میں سے شرک نکالیں گے۔ وہ اسلام اور پیغمبر اسلام کا دفاع کرے گا اور ہم اسے باطل مذاہب کی خدمت تصور کریں گے۔ وہ اصلاح کے لیے اٹھے گا اور ہم اسے غیر ملکی طاقتوں کا ایجنٹ قرار دے کر رد کر دیں گے۔

ہم یہ تصور کرنے کے لیے تیار نہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب انسان غلطی کر سکتے ہیں۔ ہر کسی میں کمزوری ہو سکتی ہے۔ معصوم اور محفوظ کوئی نہیں۔ اپنے جس عالم کو ہم ہر خطا سے پاک سمجھتے ہیں، وہ ٹھوکر کھا سکتا ہے اور جس کے شیطان ہونے کا ہمیں یقین دلا دیا گیا ہے وہ ایک سچا اور مخلص مسلمان ہو سکتا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو معاشرے میں نفرت اور انتشار کو بڑھاتی چلی جاتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ فرقہ واریت اور تعصّبات پیدا کرنے والے لوگ اگر الزام و بہتان کا طوفان اٹھاتے ہیں تو اسے پھیلانے کی خدمت اپنی کمزوریوں کی بنا پر عام لوگ سرانجام دیتے ہیں۔ مگر یہ سرتاسر قرآن و حدیث کی خلاف ورزی پر مبنی رویہ ہے۔ یہ جھوٹ پر مبنی وہ رویہ ہے کہ جو اللہ کے غضب کو دعوت دیتا ہے۔ اس سے بچنا ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے۔

فرقہ واریت اور گروہی تعصب: کچھ عملی مسائل

فرقہ واریت اور گروہی تعصب کس طرح پیدا کیا جاتا ہے اور اس سے کیسے بچا جا سکتا ہے، ہم نے پیچھے واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اب ہم اس بات کو واضح کرنے کی کوشش کریں گے کہ عملی طور پر یہ معاشرے میں کس قسم کا انتشار اور مسائل پیدا کرتا ہے۔

معاشرتی انتشار اور فساد

تعصّبات کا فروغ ہر پہلو سے ایک منفی عمل ہے۔ آج معاشرے میں مذہبی بنیادوں پر جو نفرت اور خلفشار ہے، جو مناظرے اور فرقہ واریت عام ہے، مذہبی اور مسلکی بنیادوں پر بے رحمانہ قتل و غارت کا جو سلسلہ جاری ہے وہ سب اسی کی عطا ہے۔ یہی ایک چیز کافی ہے جو اس رویے کے باطل ہونے کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ تاہم اس پر تفصیلی گفتگو کی اس لیے ضرورت نہیں کہ یہ وہ نقصانات ہیں جو آج کھل کر سب لوگوں کے سامنے آ چکے ہیں۔ عوام و خواص سب نہ صرف ان مسائل سے آگاہ ہیں بلکہ اس بات کو سمجھتے ہیں کہ یہ چیزیں کس طرح معاشرے کی جڑیں کھوکھلی کر رہی ہیں۔

نہ صرف عام لوگ بلکہ مذہبی پس منظر کے لوگوں کو بھی اندازہ ہو چکا ہے کہ یہ جن جب بے قابو ہو جاتا ہے تو بات الزام و بہتان اور فتویٰ بازی تک محدود نہیں رہتی۔ وہ زمانہ گزر گیا جب آپ کسی فرقے کے خلاف ایک تقریر کر کے اور اپنے لوگوں سے داد سمیٹ کر واپس گھر لوٹ

آتے تھے۔اب نفرت پھیلانے کے بعد آگ لگ جاتی ہے اور خون بہنے لگتا ہے۔ یہ خون کسی ایک فریق کا نہیں ہوتا بلکہ تمام گروہ کم یا زیادہ اس کا نشانہ بننے لگتے ہیں۔نفرت پھیلانے والا جلد یا بدیر خود اس نفرت کا نشانہ بن جاتا ہے۔اس لیے الحمدللہ تمام مکاتب فکر کے معقول لوگ اور اہل علم اب اس طرف توجہ دلانے لگے ہیں کہ یہ رویہ درست نہیں ہے۔

باشعور لوگوں کو دین سے دور کرنے کا سبب

تعصب اور فرقہ واریت کا میرے نزدیک ایک اور بہت بڑا نقصان ہے مگر بالعموم لوگ اس سے واقف نہیں ہیں۔ یہ مسئلہ ہے پڑھے لکھے اور باشعور مسلمان کا ذہنی اور فکری ارتداد جو اس تعصب، دھڑے بندی اور فرقہ واریت کی وجہ سے پیدا ہوجاتا ہے۔میں اسے تفصیل سے سمجھانے کے لیے بطور کیس اسٹڈی ذاتی مثال زیر بحث لا رہا ہوں۔آپ اسے معاشرے کے ایک عام نوجوان ذہن کی داستان سمجھ کر پڑھیے گا۔اس سے آپ کو اندازہ ہوجائے گا کہ فرقہ واریت اور تعصب وہ دودھاری تلوار ہے جو کچھ لوگوں کو غلو، تشدد اور قتل وغارت گری تک لے جاتا ہے تو کچھ اور لوگوں کو خود دین ہی سے برگشتہ کر دیتا ہے۔خاص کر وہ باشعور لوگ جو معاشرے پر اثر انداز ہونے کی زیادہ صلاحیت رکھتے ہیں۔

ایک وضاحت

میں جس داستان کو سنانے جا رہا ہوں اس سے قبل یہ وضاحت بہت ضروری ہے کہ اس میں بعض معاصر مکاتب فکر کے بارے میں سخت الفاظ ملیں گے۔لیکن یہ ہرگز ہرگز میرے الفاظ اور میرا نقطہ نظر نہیں بلکہ دل پر جبر کر کے میں نے یہ چیزیں اس لیے نقل کی ہیں کہ یہ بتا سکوں کہ کچھ لوگ جب تعصب کا شکار ہوجاتے ہیں تو کس طرح ایک دوسرے کے خلاف سخت ترین زبان اختیار کرتے ہیں۔میں ان تمام مکاتب فکر سے محبت کا تعلق رکھتا ہوں۔ میرا اپنا ذاتی نقطہ نظر ان

سب کے بارے میں یہ ہے کہ یہی وہ لوگ ہیں جو اصول میں ٹھیک جگہ کھڑے ہوئے ہیں۔ قرآن مجید اور سنت کی شکل میں جو دین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انسانیت کو دے کر گئے ہیں اس کی ایک زندہ روایت اِنہی کے ہاں جاری وساری ہے۔ بدقسمتی سے یہ اہم ترین بات ان لوگوں کے ہاں بہت کم اہم رہ گئی ہے اور ان کے باہمی فروعی اختلافات اتنے بڑھ چکے ہیں کہ اس کی بنیاد پر ایک دوسرے کے خلاف سخت الزام والفاظ کا تبادلہ عام ہے۔

میں نے ان تمام مکاتب فکر اور دیگر اہل علم سے بھی استفادہ کیا ہے اور میں ان کے بارے میں اچھی رائے ہی رکھتا ہوں۔اس تحریر کا اصل مقصد بھی لوگوں اس بات کی طرف توجہ دلانا ہے کہ فروعی اختلافات کو چھوڑیں اور جن بنیادی اصولوں پر اتفاق ہے ان کو نمایاں کریں۔کیونکہ یہی مسلمانوں میں اتحاد پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔

ویسے مجھے یہ وضاحت کرنے کی ضرورت ہرگز نہیں تھی کیونکہ جو بات میں بیان کرنے جا رہا ہوں وہ اپنے پس منظر میں بالکل صاف اور واضح ہے۔مگر کیا کیجیے اس معاشرے میں بدقسمتی سے ایسی بیمار ذہنیت بھی موجود ہے جو مخالفت پر آمادہ ہو کر کسی بھی بات کا بالکل الٹا مطلب نکالنے میں ماہر ہے۔اسے ایک مثال سے یوں سمجھیں مشہور مناظر احمد دیدات جنھوں نے ساری زندگی مسیحی مشنری سے مناظرے کر کے اسلام کا دفاع کیا، ان کے ایک مخالف نے ان پر الزام لگایا کہ وہ درحقیقت مغرب کے ایجنٹ ہیں جو مسیحیت پھیلا رہا ہے۔ پوچھا گیا کہ یہ کیسے ممکن ہے؟ جواب ملا: کیا احمد دیدات کی ہر تقریر میں بائبل کا حوالہ اور حضرت عیسیٰ کا ذکر نہیں ہوتا؟ یہی ان کے عیسائی ہونے کا ثبوت ہے۔

آپ چاہیں تو اس صورتحال پر ہنسیں یا روئیں یہ آپ کی مرضی ہے مگر یہ مریضانہ سوچ بہرحال ہمارے ہاں موجود ہے جس کے سامنا ہر اس شخص کو کرنا پڑتا ہے جو ہمارے ہاں اسلام

کے دفاع کے لیے کھڑا ہوتا ہے اور کچھ نہ کچھ مقبولیت حاصل کر لیتا ہے۔

ایک نوجوان کی داستان

میں بچپن سے گہرے مذہبی رجحانات رکھنے والا شخص ہوں۔ میرے گھر کے قریب جو مسجد تھی وہ بریلوی مکتب فکر کی تھی۔ مسجد کے امام علامہ عبدالمصطفیٰ صاحب تھے۔ وہ جلالی طبیعت کے مالک ایک زبردست خطیب تھے جن کی زندگی کا مشن تمام دیوبندیوں اور اہل حدیث حضرات کو گستاخ رسول، گمراہ، بددین اور مرتد و زندیق ثابت کرنا تھا۔

کئی برس اس ماحول میں گزارنے کے بعد میری ذہنی ساخت اس درجہ متعصّبانہ ہو چکی تھی کہ مجھے دیوبندیوں اور اہل حدیث حضرات (جنہیں بطور ایک مذہبی گالی کے وہابی کہا جاتا ہے) سے سخت نفرت ہو چکی تھی۔ تاہم میری ایک خوش قسمتی یہ تھی کہ مجھے بچپن ہی سے بے پناہ مطالعے کی عادت تھی۔ مگر چونکہ ہمیں یہی سکھایا جاتا تھا کہ کبھی کسی دوسرے مسلک کے گمراہ اور بددین عالم، گلابی کافر (دیوبندی یعنی بظاہر ادب کے ساتھ نبی پاک کا ذکر کر کے دھوکہ دینے والے منافق) اور کالے کافر (یعنی علانیہ گستاخی رسول کے مرتکب اہل حدیث حضرات) کی کتاب نہیں پڑھنا، اس لیے زیادہ تر مطالعہ کہانیوں کا تھا۔ وہ نہ ملتیں تو اپنے بڑے بھائی بہنوں کی کورس کی کتابیں چاٹ جاتا۔ میں جب مڈل اسکول میں تھا تب بھی بی اے تک کی سطح کی مذہبی، تاریخی اور ادبی کتابیں پڑھنا میرا معمول تھا۔ خاص کر علامہ اقبال کا تو میں شیدائی تھا اور ان کے کلام کو سمجھنے کے لیے پروفیسر سلیم چشتی اور دیگر اہل علم کی تشریحات خرید کر لاتا اور کلام اقبال کو سمجھ کر پڑھتا۔ میں مطالعے کا اتنا عادی تھا کہ کوئی نئی کتاب نہ ملتی تو بیسیوں دفعہ پڑھی ہوئی کتاب پھر پڑھ جاتا۔

میری دوسری خوش قسمتی یہ ہوئی کہ چند برس بعد مولانا عبدالمصطفیٰ صاحب کسی اور علاقے کی مسجد میں چلے گئے۔ یوں دوسرے اہل علم کے بارے میں نفرت میں مبتلا کرنے کا ماحول باقی

نہ رہا۔ حالات نے تیسری مثبت کروٹ یہ لی کہ اسی زمانے میں میں اپنے گھر والوں کے ہمراہ سلسلہ وارثیہ کے ایک صوفی بزرگ سے بیعت ہو گیا۔ یوں مذہبی ذوق کا رخ مناظرانہ نفرت کے بجائے اذکار و تسبیحات کی طرف مڑ گیا۔ صوفی ویسے بھی عام مذہبی لوگوں کی طرح نفرت نہیں پھیلاتے۔ اس لیے غیر بریلویوں کے خلاف نفرت کم نہیں ہوئی تو بڑھی بھی نہیں۔

اسی دوران میں بڑے بھائی گھر میں تفہیم القرآن کا سیٹ لے آئے۔ میری چوتھی خوش قسمتی یہ تھی کہ مولانا عبدالمصطفیٰ صاحب نے کبھی مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کو براہ راست موضوع نہیں بنایا تھا اور ان کے خلاف کوئی منفی بات ذہن میں نہیں تھی۔ ورنہ ہمارے ہاں جس طرح نفرت، تعصب اور بائیکاٹ کرنے کا ذہن بنایا جاتا ہے، اس کے بعد ممکن ہی نہیں تھا کہ میں مولانا مودودی کی کوئی تصنیف پڑھتا۔ بہرحال میں نے تفہیم القرآن کا مطالعہ شروع کر دیا۔ جن لوگوں نے تفہیم القرآن پڑھی ہے وہ جانتے ہیں کہ ایک انتہائی آسان اور دلچسپ تفسیر ہے جو معلومات کا بھی بے پناہ ذخیرہ اپنے اندر رکھتی ہے۔

تاہم اس کے مطالعے کے دوران بارہا ایسے مقامات آجاتے جو میرے تعصّبات کے خلاف تھے۔ ایسے میں بلامبالغہ دل یہ چاہتا کہ مولانا مودودی میرے سامنے آجائیں اور میں تفہیم ان کے سر پر دے ماروں (مجھے اب تو ان خیالات پر بھی ندامت ہے، مگر اس وقت تعصب میں مبتلا ہونے کی وجہ سے یہی حال ہوتا تھا، جبکہ آج نوجوانوں کو فریق مخالف کو قتل کرنے پر اکسایا جاتا ہے)۔ تفہیم بند کر کے میں رکھ دیتا مگر پڑھنے کی عادت اتنی پختہ تھی کہ جب مطالعے کے لیے کچھ اور نہ ملتا مجبوراً دوبارہ اسے کھول کر بیٹھ جاتا اور پڑھتا رہتا۔

کچھ سوالات

یہ کتاب جو قرآن، تفسیر، حدیث، فقہی اور تاریخی معلومات کا ایک انسائکلوپیڈیا ہے، آخر کار

میرے ذہن میں اپنے نقطہ نظر اور تعصّبات کے متعلق کچھ سوالات پیدا کر گئی۔ مزید یہ کہ اس نے غیر بریلوی علما کی کچھ اور کتابوں کے مطالعے کا راستہ بھی ہموار کر دیا۔ مثلاً مولانا شبیر احمد عثمانی کی تفسیر عثمانی اور مفتی شفیع کی معارف القرآن وغیرہ۔ مجھے پہلی دفعہ معلوم ہوا کہ جن بنیادوں پر میں دوسرے لوگوں کو گمراہ سمجھتا تھا وہ سرتاسر غلط تھیں۔ یہ غلط فہمیاں تھیں جو پھیلائی گئی تھیں۔ یہ تعصّبات تھے جو ذہن میں بٹھائے گئے تھے۔ یہ جھوٹ اور بہتان تھا جس کی گرد نے ہر منظر کو آلودہ کر دیا تھا۔ پھر دوسرے لوگوں کی بریلویوں کے خلاف لکھی گئی کتابیں علم میں آئیں تو پتہ چلا کہ معاملہ یکطرفہ نہیں تھا بلکہ انہوں نے بھی بریلویوں کے ساتھ یہی کچھ کیا تھا۔ وہی الزام، وہی بہتان، وہی بدنیتی پر مبنی تحریریں اور تقریریں، وہی پورے اعتماد سے بولا گیا جھوٹ اور وہی پورے یقین سے لگائے گئے کفر، شرک، بدعت اور گمراہی پر مبنی فتوے، وہی بات کو سیاق وسباق سے کاٹنا، وہی الفاظ کے موقع محل کو نظر انداز کرنا، وہی مجموعی شخصیت اور تعلیم کو کونے میں رکھ کر اپنے مطلب کی باتیں نکالنا۔ میں اپنے قارئین سے سچ عرض کرتا ہوں کہ یہ تمام تحریریں ایسی ہیں کہ کسی شخص پر اور مکتب فکر پر آپ کا اعتماد باقی نہیں رہ سکتا۔

خیر اس وقت اِن سب کے ساتھ قرآن مجید کے براہ راست مطالعے نے یہ واضح کرنا شروع کر دیا تھا کہ جن چھوٹی اور ناقابل تذکرہ باتوں اور چیزوں پر ہمارے ہاں کفر وضلالت کے فتوے جاری ہوتے ہیں وہ قرآن کریم میں سرے سے زیر بحث ہی نہیں آتے۔ حالانکہ لوگوں کا کفر و ایمان ہی قرآن مجید میں سب سے بڑھ کر زیر بحث رہا ہے۔

بہرحال اس پورے مطالعاتی عمل سے یہ دھماکہ خیز سوال پیدا ہوا کہ اگر مولانا عبدالمصطفیٰ صاحب پورے یقین (ان کے یقین کا عالم یہ تھا کہ دوران خطاب منبر پر تقریر کے دوران میں یہ کہتے تھے کہ میں جو بات کہہ رہا ہوں وہی قیامت کے دن کہوں گا چاہے مجھے اللہ تعالیٰ جہنم میں

پھینک دے) اور اعتماد کے ساتھ گفتگو کر کے اگر غلط رہنمائی کر سکتے ہیں تو اس کا کیا ثبوت ہے کہ دیگر لوگ بھی یقین واعتماد سے بات کر کے یہی معاملہ نہیں کر سکتے۔ یقین سے اپنی بات کو بیان کرنا میرے لیے اتنا بے وقعت ہو چکا تھا کہ سوال یہ پیدا ہو گیا کہ اس کا کیا ثبوت ہے کہ خود قرآن مجید جو کچھ بیان کر رہا ہے وہ سب ٹھیک ہے۔

اس آخری بات کا پس منظر یہ تھا کہ میں اس زمانے میں بیسویں صدی کے معروف ملحد اسکالر اور سائنسدان کارل ساگان کے ذریعے سے الحاد، انکار خدا اور مذہب کے مغربی تصور سے متعارف ہونا شروع ہو چکا تھا۔ یہاں ہر جگہ سائنٹفک دلیل کی بات ہوتی تھی جبکہ میں قرآن مجید کا ایک بالکل ابتدائی طالب علم تھا جس کا خیال یہی تھا کہ اس میں بس یقین واعتماد کے ساتھ ایک ہستی کلام کر رہی ہے جسے دلیل سے کوئی زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔

دلائل قرآن

یہاں میں جملہ معترضہ کے طور پر یہ عرض کر دوں کہ قرآن مجید بلاشبہ یقین کی زبان میں گفتگو کرتا ہے اور اس میں کیا شک ہے کہ عالم کے پروردگار کو اسی شان کے ساتھ کلام کرنا چاہیے۔ مگر ہمارا شہنشاہ ہمارا معلم بھی ہے۔ اس نے توحید، رسالت اور آخرت کے عقائد کو یقین کی زبان میں بیان کرنے کے ساتھ انتہائی سائنٹفک بنیادوں پر سمجھایا بھی ہے۔ مگر بدقسمتی سے قرآن ہمارے ہاں اس پہلو سے بہت کم زیر بحث آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا اس بندہ عاجز پر یہ بہت بڑا احسان ہے کہ قرآن مجید کے یہ سائنٹفک دلائل اس نے اپنے فضل سے اس گنہ گار پر ٹھیک اسی وقت واضح کیے تھے جب میں ''جب زندگی شروع ہوگی'' کی تصنیف سے فارغ ہوا تھا۔ اب میری زندگی کی یہ سب سے بڑی خواہش ہے کہ میں قرآن مجید کے ان سائنٹفک، منظّم، مرتب دلائل جو سرتاسر عقل عام پر مبنی ہیں ایک ڈاکومنٹری کی شکل میں دنیا کے سامنے پیش کروں۔ جس

طرح کارل ساگان نے اپنی شہرہ آفاق ڈاکومنٹری ''کاسموس'' سے ایک دنیا کو متاثر کیا اور خدا کے بغیر کائنات کا تعارف کرایا میں خدا کی بنیاد پر کائنات کا وہ تعارف کرا سکوں جس طرح قرآن مجید انہیں پیش کرتا ہے۔ اس مقصد کے لیے میں نے اپنی کتابوں کی اشاعت سے ہونے والی آمدنی مختص کردی ہے۔ جو میں کرسکتا تھا وہ میں نے کردیا۔ باقی معاملہ اب مالک کائنات کے ہاتھ میں ہے۔ و الی اللہ المستعان ۔

سب ہی کافر

خیر اس زمانے میں میرا خیال یہی تھا کہ قرآن مجید میں اس نوعیت کے دلائل نہیں پائے جاتے جو سائنٹفک بنیادوں پر کوئی مقدمہ ثابت کرسکیں۔ مگر متعصّبانہ دینی فکر کی اصل خرابی یہ تھی کہ یہاں ہر شخص دوسرے کو خود ساختہ دلائل سے گمراہ ثابت کرنے میں مشغول تھا۔ بریلوی اگر اپنے نقطہ نظر میں درست نہیں تھے اور تعصب کی بنیاد پر کھڑے تھے تو باقی لوگوں کا معاملہ بھی بالکل یہی تھا۔ وہی الزام، بہتان، کفر و گمراہی کے فتوے۔ بریلویوں کے ہاں مخالف گستاخ رسول تھے تو اہل حدیث اور دیوبندیوں کے لیے یہ مشرک تھے۔ یہاں سے بددین کی صدا بلند ہوتی تو وہاں سے بدعتی کا نعرہ بلند ہوتا تھا۔ یہاں سے کفر و ضلالت کے فتوے جاری ہوتے تو وہاں سے ارتداد اور گمراہی کے سرٹیفکیٹ جاری کیے جاتے۔ یہ سب مل کر بالاتفاق اہل تشیعہ کو کافر قرار دیتے اور وہاں سے بھی ''یا علی مدد'' کے ساتھ ان کے لیے ایسا ہی ''تحفہ اثنا عشریہ'' آتا۔ ہمارے زمانے میں تو خیر فرقہ وارانہ مخالفت پر مبنی یہ کتابیں بڑی مشکل سے ملتی تھیں اور میرے جیسا کتابی کیڑا ہی ان کو ڈھونڈ کر چاٹ سکتا تھا، مگر اب تو انٹرنیٹ پر بڑی آسانی سے یہ سب دستیاب ہے۔ تمام مسالک اور مکاتب فکر کے ایک دوسرے کے خلاف دیے گئے کفر و گمراہی کے ''ثبوت'' آپ جب چاہیں بآسانی ڈھونڈ کر استعمال کرسکتے ہیں۔ مسالک اور مکاتب فکر کے بیان سے کسی کو کوئی غلط فہمی نہ ہو کہ ان

کے علاوہ دیگر تنظیموں، اداروں اور اہل علم کو کفر و ضلالت کی اس مہم سے کوئی استثنا حاصل ہے۔ ہر وہ عالم یا جماعت جو مقبول ہوئی ان سب کے خلاف لکھا اور بولا گیا۔ یہ سارا مواد جس میں آپ ان پر لگائی گئی گمراہی اور کفر کے الزامات کی تفصیل دیکھ سکتے ہیں بآسانی انٹرنیٹ پر دستیاب ہے۔

میرے جیسے ایک سادہ طبیعت نوجوان کے لیے دوسروں کو کافر و گمراہ قرار دینے والے لٹریچر کا حاصل مطالعہ یہ تھا، اور آج کے ذہین نوجوانوں کے لیے بھی یہی ہے کہ ان سب نے ایک دوسرے کو تو گمراہ ثابت کردیا ہے، اگلا نتیجہ جو خود بخود نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ سب ہی کافر اور گمراہ ہیں۔ بلکہ مذہب اپنی ذات میں ایک ڈھکوسلہ ہے۔ مذہب اہل مذہب کی ایجاد ہے جو اپنے مفادات اور تعصّبات کے لیے خدا، رسول اور آخرت جیسے تصورات کو استعمال کرتے ہیں۔ یہ وہ نتائج فکر ہیں جن تک پہنچتے ہوئے کسی نوجوان کو زیادہ دیر نہیں لگتی ہے۔

تمام مذاہب کا معاملہ یہی ہے

یہ معاملہ مسلمانوں کا نہیں بلکہ تمام مذاہب کا ہے۔ جیسا کہ غالباً برٹینڈ رسل نے بیان کیا تھا کہ ایک عیسائی راہب اپنا نفس مارنے کے لیے آٹھ سال پتھر سے ٹیک لگا کر کھڑا رہا۔ وہ اس ریاضت سے فارغ ہوا تو اسے معلوم ہوا کہ ایک دوسرا راہب یہ کام دس برس تک کرچکا ہے جس پر وہ غصے سے جھنجھلا اٹھا۔ یہی مروجہ مذہبیت کی کل حقیقت مجھے سمجھ آئی کہ ساری دینداری، ریاضت اور تقویٰ کے بعد بھی جہاں حسد، نفرت، غصہ اور جھنجھلاہٹ ہی ہو وہ مذہب نہیں مذہب کا استعمال ہے۔ یہ دین کی خدمت نہیں دوکانداری ہے۔

یہ وہ وقت تھا جب میں اپنے شہر کے سب سے بڑے کالج کا طالب علم تھا۔ میرے گھر والے اور بالخصوص میری والدہ میری غیر معمولی ذہانت اور تعلیمی کامیابیوں کی بنا پر یہ توقع رکھتے تھے کہ میں فنانس یا میڈیکل جیسے کسی شعبے میں اعلیٰ مقام حاصل کروں گا۔ مگر کالج کے یہ سال میں نے

بڑے اضطراب میں گزارے۔ آخر میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ سب سے آسان راستہ اس مسئلے کو حل کرنے کا یہ ہے کہ جس ہستی کی وجہ سے یہ سارا مسئلہ پیدا ہو رہا ہے اس سے براہ راست معاملہ کیا جائے۔ قرآن مجید کو ترجمے سے بار بار پڑھنے کی وجہ سے میں اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات سے اچھی طرح واقف ہو چکا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ کس اعتماد کے ساتھ کہتا ہے کہ میں سب جانتا ہوں اور مجھے ہر شے کی خبر ہے۔ اگر یہ بات درست ہے تو راستہ آسان تھا۔ اس سے بات کر کے دیکھ لی جائے۔ وہ ہوگا تو تھوڑے عرصے میں جواب آجائے گا۔ نہیں ہوگا تو کہانی ختم۔

اس کے بعد میں کم و بیش ایک برس تک اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا رہا۔ مغرب اور عشا کے درمیان مراقبہ اور اذکار میرا معمول تھے۔ دراصل اس پورے فکری عمل میں میں نے عملی عبادات کبھی نہیں چھوڑی ہیں، بے دلی سے سہی مگر انہیں اختیار کیے رکھا۔ اذکار کے بعد میں نے آدھے پونے گھنٹے تک دعا کرنا معمول بنالیا۔ تاہم اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ کوئی خواب بھی نہیں آیا۔ البتہ یہ ہوا کہ میٹرک میں پورے اسکول میں ٹاپ کرنے والا طالب علم انٹر میں کالج کے ان گنتی کے طالب علموں میں شامل ہو چکا تھا جن کی سیکنڈ ڈویژن آئی تھی۔ جس ذہنی اضطراب میں میں تھا اس میں یہ ہونا بھی معجزہ تھا۔ اگلے سال اسی حال میں پرسنٹ ایج بہتر کرنے کی کوشش کی۔ نتیجہ اور خراب ہو گیا۔ البتہ اس برس گھر والوں کے ساتھ عمرہ کرنے چلا گیا۔ سچی بات ہے یہ ایک رسمی عمل تھا۔ میری کیفیت غالب کے الفاظ میں یہ تھی۔

بے دلی ہائے تماشہ کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
بے کسی ہائے تمنا کہ دنیا ہے نہ دیں
لاف دانش غلط و نفع عبادت معلوم
دُردِ یک ساغر غفلت ہے چہ دنیا و چہ دیں

(مناظر دنیا میں نہ عبرت رہی نہ ذوق کی تسکین ملی، خواہشات دنیا کی پوری ہوئیں نہ دین کی۔ علم و دانش ہو یا عبادت سب لایعنی ہو چکے ہیں اور دین و دنیا غفلت کے پیالے کی تہہ میں بیٹھی بیکار کیچڑ بن چکے ہیں)

نصرت الٰہی

یہ دو تین برس بظاہر بے عملی، ناکامیوں اور شکستوں کے سال تھے، مگر زندگی کی تبدیلی کے برس بھی یہی تھے۔ کیونکہ اللہ کو پکارنا کبھی بے کار نہیں جاتا۔ خواب دکھانا ان کا اصل طریقہ نہیں بلکہ وہ راستے ہموار کر دیتے ہیں۔ یہی میرے ساتھ ہوا۔ اس دور میں میرا سارا مطالعہ ختم ہو گیا اور میری توجہ صرف اور صرف قرآن مجید کو سمجھ کر پڑھنے کی طرف ہو گئی۔ نجانے کس طرح میرا دل اس طرف آ گیا حالانکہ پہلے یہ مجھے ایک بالکل بورنگ کام لگتا تھا۔ پہلے میں تفسیر پڑھتا تھا اور ترجمہ قرآن کو سرسری طور پر دیکھتا تھا۔ مگر اب تفسیر کو چھوڑ کر میں نے قرآن کریم کے اصل الفاظ کو سمجھ کر گہرا مطالعہ شروع کر دیا تھا۔ اس طریقے سے فائدہ یہ ہوا کہ مجھ پر قرآن مجید کی بنیادی دعوت بالکل واضح ہو گئی۔ یہ دعوت توحید و آخرت کی دعوت اور اعلیٰ اخلاقی رویوں کو اختیار کرنے کی دعوت تھی۔ یہ وہ دعوت تھی جو ہماری متعصّبانہ اور فرقہ وارانہ فکر میں سرے سے غائب ہے۔ اسی طرح یہ بات سامنے آئی کہ الحاد و انکار خدا کے علمبردار بڑے اہل علم جیسے برٹینڈ رسل وغیرہ کا اصل اعتراض اس دعوت پر نہیں بلکہ اہل مذہب کے پیش کردہ تصور مذہب پر تھا۔ عقائد پر ان کا جو اعتراض تھا وہ نامکمل علم اور مسیحی پس منظر کی بنا پر تھا۔

مثلاً وہ نفس مذہب اور وجود باری تعالیٰ کے منکر تھے مگر اس کی اصل وجہ برٹینڈ رسل نے اپنی شہرہ آفاق کتاب Why I am not a Christian کے مقدمے میں اس طرح بیان کی ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک علیم و قدیر اور خدائے مہربان یہ وسیع و عریض کائنات اربوں برس پر

مشتمل مراحل سے گزار کر اس لیے تخلیق کرے کہ آخر کار یہاں ہٹلر، اسٹالن اور ہائڈروجن بم جیسی چیزیں ظہور پذیر ہوں۔ رسل کے اصل الفاظ درج ذیل ہیں۔

There is to me something a little odd about the ethical valuations of those who think that an omnipotent, omniscient, and benevolent Deity, after preparing the ground by many millions of years of lifeless nebulae, would consider Himself adequately rewarded by the final emergence of Hitler and Stalin and the H-bomb.

اس کے بعد وہ لکھتا ہے:

I am firmly convinced that religions do harm as I am that they are untrue.

ترجمہ: ''میں پوری طرح اس کا قائل ہوں کہ مذاہب جھوٹے ہونے کے ساتھ نقصان دہ بھی ہیں۔''

اگر قرآن مجید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نکال دیا جائے اور سامنے صرف وہ مذہبی فکر رکھی جائے جو رسل کے سامنے تھی یا پھر جس کا ذکر میں اس مضمون میں کر رہا ہوں تو رسل کا اعتراض اور نتائج فکر سو فیصد درست ہیں۔ تاہم خوش قسمتی سے ختم نبوت کے بعد قرآن مجید کو اللہ تعالیٰ نے اس طرح محفوظ کر دیا ہے کہ اس کا ترجمہ پڑھ کر بھی ایک عام انسان اس کی بنیادی دعوت سمجھ سکتا ہے جو اس اعتراض کی کمزوری واضح کر دیتی ہے۔ یعنی یہ اعتراض مروجہ مذہبی فکر اور مذاہب کے علمبرداروں پر درست ہے، قرآن مجید پر نہیں۔ قرآن مجید واضح طور پر بیان کرتا ہے کہ اللہ کے نزدیک اصل اہمیت آخرت کی ہے دنیا کی نہیں اور وہاں کامیابی ان لوگوں کو ملے گی جو اعلیٰ اخلاقی رویوں پر قائم رہے۔

جیسا کہ میں نے ابتدائیہ میں عرض کیا تھا کہ اس عاجز نے قلم تو اسی لیے اٹھایا تھا کہ قرآن مجید کی یہ دعوت جو پورے قرآن میں بکھری ہے اسے ''قرآن کا مطلوب انسان'' کے نام سے ایک جگہ جمع کر دوں، لیکن بیچ میں کچھ ایسے رویے آ گئے جو ان مطلوب رویوں کو لوگوں کی نگاہوں میں غیر اہم بنا دیتے ہیں۔ یہ بھی شاید حکمت الٰہی ہے کہ مطلوب سے پہلے نامطلوب کو واضح کر دیا جائے۔

حق کی تلاش

خیر خلاصہ یہ کہ میں سمجھ چکا تھا کہ قرآن مجید کی دعوت پر وہ اعتراض بنتا نہیں جو ملحدین اٹھا رہے ہیں۔ یوں وجود باری تعالیٰ پر میرا فکری اعتماد بحال ہو گیا۔ مگر ایک دوسرا پہاڑ اب سامنے آ چکا تھا۔ کیا اس سفر کو آدھا چھوڑ دیا جائے یا پھر سچائی کی دریافت کے اس سفر کو آخری منزل تک پہنچایا جائے۔ اللہ ہے لیکن وہ عملی طور پر کس گروہ کے ہاں پایا جاتا ہے۔ کس کی بات سچی ہے۔ یہ تو ممکن نہیں کہ کوئی بھی حق پر نہ ہو۔

یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے میرے راستے خود متعین کر دیے۔ میں نے بطور کیریئر جن چیزوں کو اختیار کرنے کا سوچا تھا، انٹرمیڈیٹ کی ناکامی کے بعد ان کے لیے ضروری تعلیم کا حصول اب کم نمبروں کی وجہ سے ممکن نہیں رہا تھا۔ میں نے کوئی اور فیلڈ اختیار کرنے کے بجائے علوم اسلامی کی باقاعدہ تحصیل کا فیصلہ کیا۔

ہدایت اگر مقصود تھی تو اس کے لیے جدوجہد ضروری تھی۔ اس کا سبب قرآن مجید کا وہ ارشاد تھا کہ ہدایت کی ذمہ داری ان لوگوں کے لیے لی گئی ہے جو جدوجہد کے لیے تیار ہوتے ہیں۔ اسی طرح قرآن کریم کے مطالعے سے یہ بھی واضح تھا کہ کفار مکہ اور یہود و نصاریٰ کی طرح تعصّبات، آباء و اجداد کے دین اور پرانی وابستگی سے چمٹے رہنے سے بھی اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتے بلکہ بارہا انسان اپنے نفس کی تاریکی کو اجالا سمجھ کر دھوکہ کھا جاتا ہے۔ چنانچہ اس عزم کے ساتھ میں نے رسمی تعلیم اور کیریر کو چھوڑ کر باقاعدہ دینی علوم سیکھنے شروع کیے کہ سچائی جس جگہ نظر آئی اور میرے نظریات کے چاہے جتنا بھی خلاف ہو، اسے میں بلا تعصب قبول کر لوں گا۔ خوش قسمتی سے ایک ایسے تعلیمی ماحول میں میں نے علوم اسلامی کی اعلیٰ تعلیم

حاصل کی جہاں حوصلہ افزائی کرنیوالے اوراختلاف کی اجازت دینے والے اساتذہ تھے۔ان میں ڈاکٹرنور احمد شاہتاز، ڈاکٹرعمر حیات سیال اور پھرڈاکٹر حافظ احسان الحق جیسے اہل علم کے نام نمایاں ہیں۔ساتھ ہی علمی کتب کا ایسا ذخیرہ یہاں موجود تھا جس میں نہ صرف اسلاف بلکہ برصغیر کے تمام نمایاں علمی روایات اور بڑے اہل علم کی کتابیں شامل تھیں۔یہاں سے ایک دوسری جدوجہد شروع ہوئی۔مگراس دفعہ پاؤں میں تعصب کی زنجیریں نہ تھیں اور شوق کا زادراہ ہمراہ تھا۔ابتدا میں تمام الہامی مذاہب یعنی اسلام، یہودیت اور مسیحیت اوراہم غیر الہامی مذاہب یعنی ہندومت، بدھ مت اور جین مت کا مطالعہ کیا۔پوری دیانت داری اور علمی طور پر یہ سمجھنا چاہا کہ ان میں کیا کمزوری ہے اور اسلام کو کس طرح ان پر برتری حاصل ہے۔وہ کیا پہلو ہے کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ایک مسلمہ حیثیت رکھتی ہے۔کس طرح آپ کی لائی ہوئی ہدایت دوسرے انبیا کے مقابلے میں قیامت تک کے لیے فیصلہ کن حیثیت اختیار کر چکی ہے۔

خلاصہ فکر

اس کے بعد میں نے مسلم فرقوں اور مسالک کا مطالعہ کیا۔میں نے بلاتعصب ہر بڑے عالم کو سنا اور پڑھا۔جس سے براہ راست استفادہ کرنا ممکن تھا، استفادہ کیا۔ان کے دلائل سمجھے۔ قرآن کی کسوٹی پر انہیں پرکھا۔لوگوں کے رویے کو سیرت حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے آئینے میں جانچا۔جو اس کسوٹی پر پورا اترا اسے ہر پسند وخواہش کے برخلاف بھی قبول کیا۔اور جو اس کسوٹی پر پورا نہ اترا اسے دل ودماغ سے کھرچ کر پھینک دیا۔اس سفر میں آج تک اللہ تعالیٰ نے جس طرح ہر قدم پر دستگیری کی ہے وہ ایک الگ داستان ہے۔مگراس کی تفصیل چونکہ اصل موضوع سے متعلق نہیں اس لیے اسے چھوڑ رہا ہوں۔

تاہم اس سفر کے نتائج فکر اس طرح بیان کروں گا کہ میں نے یہ جان لیا کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کی سچائی باقی رکھنے کا طریقہ یہ اختیار کیا ہے کہ اصل حفاظت قرآن اور دین کے عملی ڈھانچے یعنی سنت کی ہے۔ان دونوں کو اس نے مسلمانوں کی اکثریت جو مسلمانوں کا مین اسٹریم بھی ہے اس میں اس طرح جاری کر دیا ہے کہ اصل دین ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گیا ہے۔یہ مین اسٹریم

بریلوی، دیوبندی، سلفی، حنفی، شافعی، مالکی یا حنبلی نام کے کسی ایک خاص مکتب فکر میں نہیں ہے بلکہ ان تمام کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور ان کے تمام تر فروعی اختلافات کے باوجود اصل دین اعتقادات اور عمل کی سطح پر الحمدللہ سب جگہ متفقہ طور پر موجود ہے۔اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے دوسرا اہتمام یہ کیا ہے کہ وہ مسلسل ایسے اہل علم پیدا کرتا رہتا ہے جو اس اصل دین کی شرح ووضاحت بھی کرتے رہتے ہیں اور کوئی گمراہی اور بدعت در آنے کی کوشش کرے تو بڑے سلیقے اور واضح دلائل کے ساتھ اس کی غلطی واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔کیونکہ اصل ماخذ محفوظ ہیں اس لیے وہ اکثر اس کوشش میں کامیاب ہوتے ہیں اور اگر کوئی افراط وتفریط پیدا ہو تو کوئی اور عالم تصحیح کر دیتا ہے۔اس اہتمام کے نتیجے میں عملی انحراف پیدا بھی ہو جائے تو وہ کبھی مسلمانوں کا اجتماعی عمل نہیں بن پاتا۔

مسلمانوں کے تمام اہل علم کا احترام کرنا بھی یہیں سے میں نے سیکھا۔کیونکہ اب میں یہ سمجھ سکتا تھا کہ کسی کو غلطی لگی ہے تو کہاں سے لگی ہے۔اسی احترام کی بنا پر کم وبیش ہر مسلک اور ہر فکر کے عالم سے بلاتعصب میں نے استفادہ کیا اور کبھی کسی تعصب کو حصول علم کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنایا۔میں اگر ان اہل علم کے نام لکھوں جن سے میں نے استفادہ کیا ہے تو لوگ حیران رہ جائیں گے کہ جس دور میں لوگ صرف ایک عالم اور ایک فرقے کے اسیر ہوتے ہیں کوئی شخص اس قدر متضاد خیالات کے اہل علم سے بیک وقت کیسے استفادہ کر سکتا ہے۔

یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک شخص مولانا شاہ احمد رضا خان بریلوی سے بھی عقیدت ومحبت رکھتا ہو اور اس شخصیت یعنی مولانا اشرف علی تھانوی سے بھی کسب فیض کیا ہو جن پر مولانا رضا نے باقاعدہ کفر کا فتویٰ دیا۔ایک شخص مولانا مودودی سے بھی دین سیکھتا ہو اور ان کے سب سے بڑے ناقد مولانا وحید الدین خان کا بھی معترف ہو۔ڈاکٹر اسرار کی نشستوں میں بھی برسوں بیٹھ کر قرآن کریم سمجھا ہو اور علامہ جاوید احمد غامدی سے بھی استفادہ کیا ہو، اہل تصوف سے وابستگی بھی جس کی اٹھان کا حصہ ہو اور ان کے بدترین ناقد اہل حدیث افکار بھی اس کے علم کا حصہ ہوں، اہل تشیع کے تصورات کو بھی جس

نے تحمل سے سمجھا اور اہل سنت کے نقطہ نظر سے بھی واقف ہو، جدید دور کے اہل علم کے کام سے بھی واقف ہو اور اسلاف کی علمی روایت کی بھی جسے خبر ہو۔ الحاد کے علمبرداروں کے اعتراضات کو بھی جو براہ راست سمجھتا ہو اور مذہب کے استدلال سے بھی بخوبی واقف ہو۔

یہ ہمہ گیر استفادہ صرف اسی وقت ممکن ہوا جب دل سے نفرت اور تعصب ختم ہو گیا۔ نفرت اور تعصب کے ساتھ انسان صرف کنویں کا مینڈک بن جاتا ہے۔ اس کے ذہن میں لاوا پکتا ہے اور زبان سے زہر اگلتا ہے۔ قلم میں سیاہی کی جگہ پوٹاشیم سائنائیڈ بھر جاتا ہے اور دل غضب کے شعلوں کا الاؤ بھڑکاتا ہے۔ یوں نفرت کا مریض صرف نفرت تقسیم کرتا ہے جبکہ اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے وابستگی انسان کو وسعت اور تحمل دیتی ہے۔ دل میں محبت پیدا ہوتی ہے اور یہی محبت انسان دوسروں میں تقسیم کرتا ہے۔ یوں محبت کا درد رکھنے والے صرف محبت تقسیم کرتے ہیں جبکہ نفرت اور تعصب کی گود میں پلنے والے صرف نفرت تقسیم کر سکتے ہیں۔

نفرت اور تعصب کا نتیجہ

اس طول بیانی سے میرا اصل مقصد یہ واضح کرنا تھا کہ مسلمانوں کے باہمی فرقہ وارانہ اختلاف اور تعصّبات پر مبنی دینداری کس طرح نوجوانوں میں یا تو نفرت اور انتہا پسندی پیدا کرتی ہے یا پھر ان کو دین اسلام سے برگشتہ کرنے کا سبب بنتی ہے۔ خاص کر انٹرنیٹ اور کیبل کے اس دور میں جب اسلام کے خلاف ہر طرح کا مواد انٹرنیٹ پر بآسانی دستیاب ہے یہ عمل کتنا تیز ہو چکا ہوگا۔ میرے پاس بہت سے نوجوان یہی مسائل اور الجھنیں لے کر آتے ہیں لیکن پروردگار کی عنایت سے میں اب اس قابل ہوں کہ کم و بیش ہر سوال کا جواب دے سکوں۔ لیکن جو لوگ تعصّبات پر مبنی دینداری اختیار کرتے ہیں درحقیقت آج بھی وہ جانے انجانے میں باشعور لوگوں کو دین سے دور کرنے کا سبب بن رہے ہیں اور برٹنڈ رسل یا موجودہ دور میں رچرڈ ڈاکنز جیسے ملحدین کی سچائی کا زندہ ثبوت بن کر مذہب کا کفن بُن رہے ہیں۔

مذہبی اختلافات کے بارے میں کچھ متفرق تحریریں

اس باب میں میرے پیش نظر اپنی کچھ ایسی تحریروں اور خطوط کو جمع کر کے قارئین کے سامنے پیش کرنا ہے جو اس عاجز کے قلم سے نکلی ہیں۔ ان تمام کا مقصد بعض عملی اور واقعاتی مثالوں سے اس بات کو واضح کرنا ہے کہ ایسے اختلافات کی شکل میں لوگوں کو کیا غلط فہمیاں لاحق ہو جاتی ہیں یا پھر لوگ کس طرح بغیر علم اور صلاحیت کے سخت لب و لہجے میں کسی اور کے بارے میں ایک فیصلہ کن بات کہنا شروع کر دیتے ہیں جس کا انہیں کوئی حق نہیں ہوتا۔ کس طرح لوگ بات کے صرف ایک رخ سے واقف ہوتے ہیں اور دوسری کہیں زیادہ روشن سچائی کبھی ان کے سامنے نہیں آتی۔ کس طرح کم علمی غلط فہمی کا باعث بنتی ہے اور کس طرح علم رکھنے والے لوگ جانتے بوجھتے اپنے مفادات کے لیے سادہ اور معصوم لوگوں کو دھوکہ دیتے ہیں۔

یہ کیسے ہوتا ہے کہ انتہائی پڑھے لکھے دانشور بھی الزام و بہتان کے عمل میں شریک ہو جاتے ہیں اور کس طرح جو لوگ پہلے اس الزام و بہتان کا شکار ہوتے ہیں، آنے والے دنوں میں خود دوسروں کے ساتھ ایسی زیادتیاں کرنے لگتے ہیں۔ ان تحریروں سے قارئین کو ان تمام باتوں کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا۔ یہ مجموعی طور پر پانچ تحریریں ہیں۔

1۔ ''جب زندگی شروع ہوگی'' پر کچھ اعتراضات کا جائزہ
2۔ آپ کو نیند کیسے آ جائے گی؟
3۔ بنی اسرائیل اور مسلمان
4۔ نظریہ سازش اور الزامی سوچ کی حقیقت
5۔ حرم پاک اور مسلمانوں کا تفرقہ

جب زندگی شروع ہوگی پر اعتراضات کا جائزہ
(پہلی تحریر)

اس تصنیف کے دیباچہ میں یہ عرض کر چکا ہوں کہ میں اپنی کتاب پر لگائے گئے کسی الزام کا دفاع نہیں کروں گا۔ الحمدللہ جو کچھ میں پیچھے لکھ چکا ہوں سچی بات یہ ہے کہ اس کے بعد اس بات کی ضرورت ہی نہیں رہی کہ ''جب زندگی شروع ہوگی'' پر اعتراضات کا جواب دیا جائے۔ آپ ذرا ایک نظر ان اصولوں کو ذہن میں تازہ کر لیجیے جو میں نے پہلے باب میں نقل کیے ہیں۔

۱) فرع کو اصل کی جگہ لے جانا اور اسے اختلاف کی وجہ بنا دینا۔

۲) علم کے بغیر اور جذبات سے مغلوب ہو کر کلام کرنا۔

۳) نبی کی جگہ پر کھڑے ہو کر اپنی ناقص رائے اور ناقص علم اور خود ساختہ معیارات پر دوسرے کے کام بلکہ ان کی نیت اور شخصیت تک پر فیصلہ دینا۔

۴) اختلاف کرتے ہوئے مستشرقین اور منافقین کے اس طریقے کو اختیار کرنا جس کے بعد نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم جیسی ہستی بھی محفوظ نہیں رہ سکتی۔

۵) مروجہ ڈگر سے ہٹ کر کسی نئے اور تخلیقی کام کی مخالفت کرنا

۶) اسلاف کے اس طریقے کو چھوڑنا جس میں وہ علم و تحقیق اور اختلاف رائے کی اجازت دیتے تھے۔

۷) الزام و بہتان کو بلا تحقیق آگے پھیلانے کی نفسیات، حسن ظن سے کام لینے کے بجائے سنی سنائی اور منفی باتوں کو دوسروں میں عام کرنا۔

قارئین میں سے جن لوگوں نے یہ تنقیدیں پڑھی ہیں یا وہ کبھی ان کو پڑھیں گے تو صاف

دیکھ لیں گے کہ ''جب زندگی شروع ہوگی'' پر کیے جانے والے اعتراضات ان تمام اصولوں کی کھلی ہوئی خلاف ورزی ہیں۔ یہی ان بیشتر تنقیدوں کا معاملہ ہوتا ہے جو فرقہ وارانہ پس منظر میں ایک متعصب ذہن کے ساتھ کی جاتیں ہیں۔ ہاں علمی تنقیدیں کچھ اور ہوتی ہیں، مگر ان کا بیان سر دست میرا موضوع نہیں ہے۔

یہاں یہ بھی خیال رہے کہ ''جب زندگی شروع ہوگی'' کوئی اختلافی نوعیت کی کتاب نہیں ہے۔ وہ دین کی مسلمہ اور بنیادی دعوت اور نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کی اساس یعنی توحید اور آخرت کی دعوت پر مبنی ہے۔ ہمارے معاصرین دین کو کیسے سمجھتے ہیں، ان کے نقطہ نظر میں کیا خرابی ہے، یہ سرے سے اس کتاب کا موضوع ہی نہیں ہے۔ میں نے نہ دین کا اپنا کوئی نقطہ نظر بیان کیا ہے نہ کسی خاص طریقے پر چلنے کی لوگوں کو دعوت دی ہے۔ جو کچھ بیان کیا قرآن و حدیث میں اس کی تفصیل یا اشارات موجود ہیں۔

اس کے باوجود اس کتاب کو ہدف بنایا گیا اور باقاعدہ پروپیگنڈا مہمیں چلائی گئیں تو اس کا سبب ہمارے معاشرے میں مذکورہ بالا اصولوں پر اختیار کی گئی متعصّبانہ دینداری ہے۔ میں ان لوگوں پر کوئی تبصرہ کر کے اپنا اور قارئین کا وقت برباد نہیں کرنا چاہتا۔ اگر میرے بیان کردہ اصولوں کے بعد بھی کسی کے ذہن میں کوئی سوال ہے تو وہ براہ راست مجھ سے کر لے۔ میں ذیل میں دو ایسے ہی سوالات اور ان کے جواب نقل کر رہا ہوں۔ یہ سوالات کسی نہ کسی حوالے سے ''جب زندگی شروع ہوگی'' پر لکھی گئی تنقیدوں کے پس منظر میں کئے گئے۔ لوگوں نے چونکہ براہ راست مجھ سے سوال کیے اس لیے میں نے ان کے تفصیلی جواب دیے۔ میرے جوابات سے قارئین کو اندازہ ہو جائے گا کہ یہ کتنی سطحی نوعیت کی چیزیں تھیں جن کی بنیاد پر اس کتاب کے بارے میں اتنا غلیظ پروپیگنڈا کیا گیا۔

ناول کا لفظ کیوں اختیار کیا گیا؟

[یہ ایک طویل سوالنامہ تھا جس کے صرف پہلے سوال اور جواب کو یہاں نقل کیا جا رہا ہے۔]

سوال: میرا آپ سے سوال یہ ہے کہ آپ نے حشر کے واقعات پر ایک ناول لکھا۔ آپ کی غیرت ایمانی نے یہ کیسے گوارا کر لیا کہ آپ واقعات محشر کو ناول جیسا گھٹیا، ذلیل، گندا عشق لڑانے والوں اور اسے پڑھ کر جنسی تلذذ حاصل کرنے والوں کی طرف مبذول کرانے والا نام دیں۔ آپ نے یہ کمینہ لفظ کس دیانت اور امانت کے بل پر اختیار کیا؟ (پ۔ن)

جواب: میرے محترم بھائی امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ آپ پر اپنا فضل و کرم فرمائے۔ میں آپ کے سوال کا جواب تفصیل سے دوں گا لیکن ابتدا میں صرف ایک چیز کی طرف توجہ دلانی ہے۔ وہ یہ کہ کسی سے بھی اختلاف رائے کرنا ہمارا حق ہے لیکن تہذیب و شائستگی کا جامہ اتار کر اس سطح پر اترنا کسی دیندار شخص کو زیب نہیں دیتا۔ آپ نے درجنوں سوالات پر مشتمل اس پورے سوال نامے میں جو زبان استعمال کی ہے وہ کسی شریف آدمی کو زیب نہیں دیتی۔ کجا یہ کہ کوئی دیندار شخص وقولوا للناس حسنا (لوگوں سے اچھی بات کہو)، جادلھم بالتی ھی احسن (ان سے اچھے طریقے سے بحث کرو) اور والذین ھم عن اللغو معرضون (جنت میں وہ لوگ جائیں گے جو لغویات سے بچتے ہیں) کے صریح قرآنی احکام کی موجودگی میں اس نوعیت کی گفتگو کرے۔ میں تو آپ کی اس کرم فرمائی پر صبر کر کے اپنے پروردگار سے اجر کی امید رکھتا ہوں، آپ البتہ دیکھ لیجیے کہ اللہ کے حیا والے نیک بندے اور بندیاں جب آپ کے یہ الفاظ پڑھیں گے تو وہ آپ کے بارے میں کیا رائے قائم کریں گے؟

میں بہرحال آپ کے لیے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کے دل سے اس نفرت کو ختم کر دے۔ اس نفرت کے ساتھ آپ اللہ تعالیٰ کے حضور پہنچ گئے تو آپ کو اندازہ ہی نہیں کہ روز قیامت آپ کی کیسی رسوائی ہوگی۔ جب آپ کو یہ بتایا جائے گا کہ تم نے انتہائی ناقص علم اور کامل جذباتیت کا شکار ہو کر اس مقام پر کھڑے ہو کر گفتگو کی تھی جو صرف ہمارے محبوب نبی کا حق ہوتا ہے، مگر یہ کرتے ہوئے تمھیں ہمارے محبوب نبی کے اخلاق یاد نہیں رہے۔ میری مودبانہ درخواست ہے کہ ہو سکے تو کچھ وقت اللہ والوں کی صحبت میں گزاریے۔ ان کی صحبت سے انسان میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق عالیہ پیدا ہوتے ہیں۔

اصل سوال کا جواب دینے سے قبل یہ تمہیدی گفتگو مجھے اس لیے کرنی پڑی ہے کہ آپ کا پورا سوالنامہ آپ کی انہی صفات کا آئینہ دار ہے۔ اب آیئے آپ کے سوال کے جواب پر۔

میرے محترم بھائی پہلی بات یہ ہے کہ ناول نگاری اصناف سخن میں سے ایک صنف ہے۔ جو اعتراض ناول نگاری پر بنتا ہے وہ دیگر تمام اصناف سخن پر بنتا ہے۔ اس لیے کہ جن بیہودگیوں کا تذکرہ انتہائی بے باکی سے آپ نے فرما دیا ہے اور جنہیں بار بار دہرانے کی یہ عاجز خود میں ہمت نہیں پاتا، وہ صرف ناول نگاری کے ساتھ خاص نہیں، دیگر اصناف سخن سے بھی یہی خدمت لی جاتی رہی ہے۔ میں صرف شاعری کی مثال دوں گا۔ کون سی بے ہودگی ہے جس کے بیان کے لیے اشعار کو استعمال نہیں کیا گیا۔ میں زبان و بیان کا وہ بے باکانہ ذوق نہیں رکھتا جو آپ کے پاس ہے اور جس کا اظہار آپ کے سوالات سے ہوتا ہے۔ اس لیے ایک بڑے شاعر حالی کا ایک شعر آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں تا کہ آپ کو اندازہ ہو کہ اشعار میں کیا کچھ کہا جاتا رہا ہے۔ وہ مسدس میں اپنے زمانے کی شاعری پر اس طرح تبصرہ کرتے ہیں:

وہ شعر و قصائد کا ناپاک دفتر
عفوت میں سنڈاس ہے جس سے بہتر

بیت الخلا کی گندگی جن اشعار سے بہتر ہو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کے مضامین کیا ہوں گے۔ آپ چاہیں تو عرب جاہلیت کے دیوان پڑھ لیجیے۔ عربی نہیں آتی تو اردو شعراء کے ''معاملہ بندی'' پر مبنی اشعار پڑھ لیجیے۔ پھر یہ سوال جو مجھ سے کیا ہے وہ حالی سے کیجیے جنہوں نے اسی مسدس میں بے مثال حمد و نعت لکھی ہے۔

کہ ہے ذات واحد عبادت کے لائق
زبان اور دل کی شہادت کے لائق
اس کے فرماں اطاعت کے لائق
اسی کی ہے سرکار خدمت کے لائق
لگاؤ تو لو اس سے اپنی لگاؤ
جھکاؤ تو سر اس کے آگے جھکاؤ

یا یہ نعتیہ اشعار دیکھیے:

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا
مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا

حالی ہی نہیں حضرت حسان بن ثابتؓ سے لے کر آج کے دن تک کے تمام حمد اور نعت گو شاعر اسی اعتراض کی زد میں آ جائیں گے۔ آپ کو ناول میں واقعات محشر بیان کرنے پر اعتراض ہے یہ شعرا تو اللہ کا ذکر، اس کی حمد اور اس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف اشعار کی شکل میں بیان کرتے ہیں۔ ''اللہ کے ذکر سے بڑی کیا چیز ہو سکتی ہے''، (العنکبوت 45:29)۔ مگر دیکھیے

کہ ایک ختم نہ ہونے والی قطار ہے جو اس خدمت پر معمور ہے۔ اس لیے برادر محترم آپ نے جو سوال مجھ ناچیز سے کیا ہے کہ میں نے ایک گھٹیا، ذلیل، گندا عشق لڑانے والوں اور اسے پڑھ کر جنسی تلذذ حاصل کرنے والوں کی اصناف سخن میں واقعات حشر کیوں بیان کیے ہیں وہ مجھ سے بڑھ کر ان سب لوگوں پر وارد ہو جاتا ہے۔

اب آیئے خاص اس ناول نگاری کی طرف جس پر آپ کو بہت غصہ ہے۔ ناول نگاری ہے کیا؟ یہ اس قصہ گوئی، داستان اور حکایت کی جدید شکل ہے جو زمانہ قدیم سے کی جاتی رہی ہے۔ اس لیے جس شخص کو ناول کے نام سے چڑ ہے وہ اسے قصہ، حکایت اور داستان سمجھ لے۔ میں کسی درجہ میں بھی اپنی کتاب کے موازنے کے لیے نہیں بلکہ یہ سمجھانے کے لیے کہ قصہ بیان کرنا ایک مثبت کام بھی ہو سکتا ہے، عرض کروں گا کہ قرآن مجید نے اپنے بیان کردہ واقعات کو ''قصص'' ہی قرار دیا ہے۔ قصہ بیان کرنا اپنی ذات میں کوئی برا کام ہوتا تو کیسے ممکن تھا کہ پروردگار عالم اپنی مقدس کتاب میں یہ کام کرتے۔

یہی وہ قصہ و حکایت ہے جو اب جدید شکل میں ناول کہلاتا ہے۔ یہ ایک صنف سخن ہے۔ میں نے یہ اس لیے اختیار کی کہ ناول کی تعریف میں یہ بات شامل ہوتی ہے کہ یہ فکشن ہوتا ہے۔ جبکہ قصہ، حکایت، داستان وغیرہ میں یہ احتمال ہوتا ہے کہ وہ سچی بھی ہو سکتی ہے اور محض ایک بیان بھی۔ میں چونکہ اس معاملے میں بہت حساس تھا کہ لوگ مرکزی کردار اور اس کی داستان کو سچ نہ سمجھ بیٹھیں اس لیے ہر ممکن کوشش کی ہے کہ یہ تاثر زائل ہو جائے۔ اس تحریر کو ناول اور ناول میں بھی کہانی کو خواب کی شکل میں لانے میں ایک اور احتیاط ملحوظ تھی۔ وہ ہمارے محدثین اور اصولیین کا مسلمہ اصول ہے کہ جب بات کہنے والا اپنی بات کے متعلق پہلے ہی کہہ دے کہ یہ موضوع یا فکشن ہے تو اس پر وہ اعتراضات کبھی پیدا نہیں ہوتے جو اللہ اور اس کے رسول کے حوالے سے کسی چیز کو پیش کرنے سے پیدا ہو جاتے ہیں۔

مزید یہ کہ کسی اصلاحی کام کے لیے ناول کی صنف کا اختیار کرنے والا میں پہلا شخص نہیں ہوں۔ آپ کو شاید علم نہ ہو مگر نسیم حجازی، ڈپٹی نذیر احمد اور بہت سے دیگر مصنفین نے اس صنف کو مذہبی معتقدات، دینی تعلیمات، اخلاقی اصلاحات اور عہد رسالتماب اور صحابہ کے واقعات کے بیان کے لیے استعمال کیا ہے۔ آج تک کسی نے یہ بے ہودہ سوال نہیں اٹھایا کہ انہوں نے اپنے کام کو ''ناول جیسا گھٹیا، ذلیل، گندا عشق لڑانے والوں اور اسے پڑھ کر جنسی تلذذ حاصل کرنے والوں کی طرف مبذول کرانے والا نام'' کیوں دیا۔

باقی اس طرح کی تمام اصناف سخن کے بارے میں قرآن مجید شاعروں کو موضوع بنا کر ایک فیصلہ کن بات اس طرح کہہ چکا ہے:

''اور شاعروں کی پیروی گمراہ لوگ کرتے ہیں۔ کیا وہ نہیں دیکھتے کہ وہ ہر وادی میں بھٹکتے ہیں؟ اور وہ کہتے ہیں جو کرتے نہیں۔ بس وہ لوگ اس سے مستثنیٰ ہیں جو ایمان لائے، جنھوں نے نیک اعمال کیے، جنھوں نے اللہ کو زیادہ سے زیادہ یاد کیا اور جنھوں نے بدلہ لیا بعد اس کے کہ ان پر ظلم ہوا''، (الشعراء 26:224-227)

فیصلہ میرا آپ کا نہیں چلے گا، قرآن مجید کا چلے گا۔ اس کا فیصلہ یہ ہے کہ اصناف سخن میں اچھی باتیں بھی ہوتی ہیں بری بھی۔ ان کے بیان کرنے والے اچھے بھی ہوتے ہیں برے بھی۔ فیصلہ اس پر ہوگا کہ وہ کیا بیان کر رہے ہیں۔ بری بات زبان سے کی جائے، نثر میں ہو، نظم میں ہو، ناول میں ہو یا شعر میں بری ہے۔ اس کے برے ہونے سے زبان، نظم، نثر، ناول اور شعر برا نہیں ہو جاتا۔ اس لیے کہ ان سب چیزوں کے ذریعے سے اچھے کام بھی ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ اللہ کا ذکر بھی جو سب سے بڑی چیز ہے۔

شہید کون ہے؟

ایک سوال شہید کے تصور کے حوالے سے کیا گیا ہے۔ اس سوال کو چونکہ بعض تنقیدوں میں بڑے زور و شور سے اٹھایا گیا ہے اس لیے اس کا جواب یہاں نقل کیا جا رہا ہے۔ سوال کرنے والے ایک محترم بھائی (م۔ح) کے الفاظ میں یہ سوال کچھ اس طرح ہے۔

''ایک بات اگر آپ مناسب سمجھیں تو ذکر کیجئے گا کہ آپ نے ماشاءاللہ جنت میں جیسے صدیق، انبیاء وغیرہ کا انعامات کے حوالے سے جب زندگی شروع ہوگی میں کافی کرداروں کا تذکرہ کیا ہے لیکن شہداء کا ذکر نہیں ملتا جو فی سبیل اللہ قتال میں شہید ہوئے۔ اس کی کوئی خاص وجہ ہے یا محض اتفاق ہے یا ہو سکتا ہے کہ میں ہی مِس کر گیا ہوں۔''

جواب: لفظ شہید قرآن مجید میں تقریباً ساٹھ مقامات پر مختلف شکلوں میں آیا ہے۔ یہ لفظ ہر موقع پر اپنے لفظی مفہوم یعنی شاہد یا گواہ کے معنوں میں استعمال ہوا ہے سوائے ایک موقع کے جہاں یہ اطلاقی مفہوم میں استعمال ہوا ہے اور جس کا ذکر آگے آ رہا ہے۔ قرآن مجید میں اصطلاحی طور پر اس کا مطلب حق کی گواہی دینے والے لوگ ہیں۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں چونکہ قرآن مجید ایک اجنبی چیز ہے اس لیے لوگ سرے سے اس بات سے واقف ہی نہیں کہ لفظ شہید کی حقیقت کیا ہے۔ ورنہ یہی وہ منصب ہے جس پر صحابہ کرام کو فائز کیا گیا تھا کہ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان پر گواہ ہوں اور وہ لوگوں پر'' (الحج 22:78)۔ ''یہی وہ کام ہے جو روزمرہ زندگی میں تمام اہل ایمان کو کرنا ہے'' (نساء 4:135)۔ ''یہی منصب ہے جو جنت کے چار کامیاب گروہوں میں سے تیسرا ہوگا یعنی انبیا صدیقین شہدا اور صالحین'' (نساء 4:69)۔

ہمارے ہاں یہ لفظ جن معنوں میں معروف ہے یعنی مقتول فی سبیل اللہ وہ قرآن مجید میں ایک جگہ اطلاقی طور پر استعمال ہوا ہے یعنی سورہ آل عمران آیت 140 میں یہ بیان ہوا کہ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے جان دے کر بھی حق کی گواہی دی۔ یعنی اس لفظ کا اصل مطلب حق کی شہادت ہے اور جو لوگ یہ کام کرتے ہوئے اپنی جان بھی نچھاور کردیں گویا کہ ان کے شہید (حق کے گواہ) ہونے میں اب کوئی شک اور گنجائش نہیں رہی۔ یہی وہ مفہوم ہے جو بعض احادیث میں بیان ہوا ہے اور جو ہمارے ہاں عوامی سطح پر زیادہ مشہور ہو چکا ہے۔ ورنہ دین پر تحقیقی نظر رکھنے والا ہر شخص یہ بات جانتا ہے کہ لفظ شہید کی اصل کیا ہے، قرآن کریم میں یہ کس معنی میں استعمال ہوا ہے۔ یہاں کسی کو یہ غلط فہمی بھی نہیں ہونی چاہیے کہ احادیث میں یہ لفظ صرف مقتول فی سبیل اللہ کے لیے استعمال ہوا ہے بلکہ متعدد روایات میں یہ اپنے اصل مفہوم میں بھی استعمال ہوا ہے۔ جیسے روایت میں آتا ہے کہ" انتم شهداء الله فی الارض "(صحیح الجامع رقم 1490،6728)۔" یعنی تم زمین پر اللہ کے گواہ ہو"۔

میں نے اپنے ناول میں مرکزی کردار کو اسی حیثیت میں پیش کیا ہے۔ اس لیے یہ سمجھنا درست نہیں کہ اس میں کسی شہید یا اس کے مقام کا ذکر نہیں ہے۔ رہا یہ سوال کہ میں نے خاص طور پر کسی مقتول فی سبیل اللہ کا ذکر کیوں نہیں کیا تو یہ تاثر اس پہلو سے درست نہیں کہ میں نے ایک مقام پر ایسے لوگوں کا ذکر اس طرح کیا ہے کہ وہ بھی بڑے اعلیٰ اجر کے حقدار ہوئے ہیں، (صفحہ 210)۔ اسی طرح دوسرے ناول "قسم اس وقت کی" میں سیدنا یاسر اور سیدہ سمیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی شہادت اور ان کی عظمت کا بیان ہے۔

ویسے بھی یہ شہداء (مقتول فی سبیل اللہ) دراصل ان شہدا کے ذیل میں ہی آجاتے ہیں جو سورہ نساء میں بیان ہوئے ہیں۔ آپ غور فرمائیے کہ میں نے تو قرآن مجید کے اس طریقے کو

اختیار کیا ہے جس میں مقتول فی سبیل اللہ کو بھی شہید کے منصب پر فائز کیا گیا ہے۔

یہ بھی ذہن میں رہے کہ اس ناول کی تالیف کا اصل مقصد ہر ہر قسم کے نیکوکاروں کا تفصیلی بیان نہیں ہے۔ کئی قسم کے اعلیٰ درجے کے جنتی ہیں جن کا میں نے ذکر نہیں کیا مثلاً اس میں نفلی روزے داروں کا ذکر نہیں جن کے لیے ایک حدیث کے مطابق جنت کا ایک خاص دروازہ یعنی ریان وقف ہے، بخاری رقم 1896۔ اس کے علاوہ بھی روزے داروں کے غیر معمولی فضائل بیان ہوئے ہیں جیسے "الصوم لی و انا اجزی به"، (بخاری رقم 1894 مسلم 2707)۔ یعنی "روزہ میرے لیے ہے اور اس کا بدلہ میں ہی عطا کروں گا"۔ اعتراض کرنے والا ذہن تو اس پر بھی اعتراض کرسکتا ہے کہ ایسی عظیم فضیلت کے باوجود روزہ داروں کا خصوصی ذکر کیوں نہیں کیا گیا۔ لیکن ہر معقول آدمی سمجھ سکتا ہے کہ میرے لیے یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ ہر قسم کی نیکی کرنے والوں کا ایک کہانی میں احاطہ کیا جائے۔

میرا اصل مقصد حشر کی منظر کشی تھا۔ یہ نہیں تھا کہ اہل جنت کی تمام اقسام کو گنوا دیا جائے اور ان کے تفصیلی معاملات بیان کیے جائیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ لوگوں نے اس اصل مقصد کو سمجھا اور ہزاروں لوگوں کی اللہ نے زندگیاں بدل دیں اور لاکھوں لوگوں تک اسلام کی بنیادی دعوت کا پیغام پہنچ گیا۔

"تم میں سے کوئی آدمی جب اپنے بھائی کو کافر کہے تو دونوں میں سے ایک اس کا مستحق بن جاتا ہے۔ یا تو وہی (سننے والا) کافر ہوتا ہے جیسا کہ کہنے والا اسے کہتا ہے یا پھر (سننے والا) نہیں ہے تو پھر یہ کہنے والے پر پلٹ آئے گا"۔ (بخاری، رقم 5752)

آپ کو نیند کیسے آجائے گی؟

(دوسری تحریر)

[یہ تحریر اصلاً ایک خط ہے جو میری کتاب ''جب زندگی شروع ہوگی'' کے خلاف منفی پروپیگنڈا کرنے والے ایک صاحب کو لکھا گیا۔ انہوں نے کتاب کے خلاف ایک مضمون لکھ کر اپنے متعلقین کو اس کتاب کے خلاف مہم چلانے پر آمادہ کیا۔ میں نے کوئی جوابی مضمون لکھنے کے بجائے ایک ذاتی خط میں ان کو توجہ دلائی، مگر بدقسمتی سے ان کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ یہ خط کسی قسم کی علمی بحث پر نہیں بلکہ کچھ اخلاقی سوالات پر مشتمل ہے جو ہمارے ہاں اکثر نظر انداز کردیے جاتے ہیں۔ میرا مقصد کسی فرد کے خلاف مہم چلانا نہیں بلکہ رویوں کی نشاندہی ہے اس لیے ان صاحب کا نام اور متعلقہ تفصیلات حذف کرکے اب یہ خط افادہ عام کے لیے قارئین کی خدمت میں پیش ہے۔]

السلام علیکم ورحمت اللہ وبرکاتہ

امید ہے کہ مزاج گرامی خیریت سے ہوں گے۔ ماہنامہ۔۔۔۔۔ کے شمارے میں اپنی کتاب ''جب زندگی شروع ہوگی'' کے حوالے سے آپ کے فرمودات دیکھنے کا موقع ملا۔ گرچہ آپ کے مضمون کے آغاز اور اختتام دونوں سے یہ حقیقت بالکل واضح ہے کہ اس مشقت کا اصل مقصد مجھ گناہگار کی اصلاح نہیں بلکہ اپنی تنظیم کے ان سادہ دل دوستوں کی اصلاح اور انہیں اس گناہ عظیم سے بچانا ہے جو اس کتاب کو پھیلا کر وہ کمارہے ہیں۔ تاہم مجھے خوشی ہے کہ آپ کی اس

تحریر کی وجہ سے اس گناہگار کو کتاب پر ایک دفعہ پھر تنقیدی نظر ڈالنے کا موقع مل گیا۔ میرے لیے اس بات کی بڑی اہمیت ہے کہ قبل اس کے کہ روز قیامت میرا احتساب ہو میں اس دنیا میں اپنا احتساب آپ کرلوں۔ ظاہر ہے کہ میں انسان ہوں غلطیاں بھی کرسکتا ہوں اور اپنے تعصّبات کا اسیر بھی ہوسکتا ہوں۔ اس لیے میں کسی بھی تنقید کو چاہے وہ کتنے ہی سخت اسلوب میں ہو، ردی کی ٹوکری میں پھینکنے اور جواب دینے کی نفسیات میں مبتلا ہوکر پڑھنے کے بجائے اپنی اصلاح کے جذبے سے پڑھتا ہوں۔ اس لیے کہ خدا اور آخرت پر ایمان وہ کہانی نہیں جو میں دوسروں کو سناتا ہوں۔ یہ اس گنہگار کی زندگی ہے۔

اس خط کا مقصد ایک طرف آپ کا شکریہ ادا کرنا تھا اور دوسری طرف اس حسن ظن کے ساتھ آپ کو کچھ چیزوں کی طرف توجہ دلانا مقصود تھا کہ میں جتنا خدا اور آخرت پر ایمان رکھتا ہوں، آپ جیسا مخلص آدمی مجھ سے لاکھوں گنا زیادہ ان حقائق کو مان کر اللہ کے حضور پیشی سے شب و روز لرزتا ہوگا۔ جب انسان کے جسم پر لباس ہوگا اور نہ بچانے والا انسان کو عالم کے پروردگار کے کڑے احتساب سے بچا سکے گا۔ اس روز انسان اپنی علمی کوتاہیوں کا تو شاید یہ عذر پیش کرنے کی جرات بھی کرسکے کہ آقا غلطی ہوگئی معاف کردے۔ مگر اخلاقی جرائم کا کوئی عذر پیش کرنا بھی اس روز ممکن نہ ہوگا۔ اس پس منظر میں میری گزارشات حسب ذیل ہیں۔

ا۔ میرا ای میل کتاب پر موجود ہے۔ کیا یہ بہتر نہ ہوتا کہ اپنے اعتراضات آپ براہ راست مجھے بھیج کر میرا نقطہ نظر جاننے کی کوشش کرتے۔ کسی شخص کے بارے میں کوئی فیصلہ سنانے سے قبل دنیا ہی نہیں آخرت کی عدالت میں بھی اس شخص کو صفائی پیش کرنے کا موقع دیا جانا عدل و انصاف کا مسلمہ تقاضہ ہے۔ آپ نے اپنے مضمون میں میرے بارے میں ابتدا ہی میں یہ فیصلہ سنادیا کہ میں نے ''حق کے پردے میں باطل تصورات کی تبلیغ بڑی مہارت کے ساتھ'' کی ہے۔ میں بڑے

ادب سے دریافت کروں گا کہ کیا آپ پیغمبر ہیں کہ جو آپ نے سمجھ لیا وہ حرف آخر ہے اور اس بنیاد پر آپ کسی مسلمان کے بارے میں جو چاہیں فیصلہ سنا دیں۔ اگر آپ پیغمبر ہیں تب بھی ''باطل کی تبلیغ'' کے جس سنگین ترین الزام جو درحقیقت کفر کا الزام ہے، کا اعلان کرنے سے قبل یہ آپ کی دینی ذمہ داری تھی کہ آپ مجھ سے میرا نقطہ نظر جانتے۔ اس لیے کہ حدیث پاک (بخاری، رقم 5752) کے مطابق اس طرح کا الزام اگر درست نہیں تو پھر اپنے لگانے والے کے کفر کا باعث بن جاتا ہے۔ میں آپ سے یہ سوال کرتا ہوں کہ کل قیامت کے دن اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنے سامنے کھڑا کر کے یہ پوچھ لیا کہ کسی کا نقطہ نظر جانے بغیر اس کے بارے میں ایک فیصلہ دینے کا تمھیں کیا حق تھا؟ میں اپنے مجرموں کو صفائی کا موقع دیے بغیر فیصلہ نہیں کرتا تو تم نے میرے ایک بندے کے بارے میں جس کے دل کا حال میں جانتا تھا یہ فیصلہ کس طرح کر لیا۔ پھر کس بنیاد پر تم نے اور تمھارے کہنے پر تمھارے ساتھیوں نے میرے بندے کے خلاف مہم شروع کر دی۔

اگر خدا اور آخرت نام کی کسی حقیقت کو آپ مانتے ہیں تو مجھے نہیں معلوم آج کے بعد آپ کو نیند کیسے آ جائے گی؟

گرچہ مذکورہ بالا بات کے بعد مجھے مزید کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں رہی کہ اگر یہی بات موثر نہیں تو مزید کچھ کہنے کا فائدہ نہیں اور اگر یہ بات اثر کر گئی ہے تو کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں۔ مزید یہ کہ میں آپ کو کسی قسم کی علمی بحث کر کے ذہنی مشقت میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ لیکن آپ کا مضمون مسلمہ علمی اور اخلاقی روایات اور عدل و دیانت کے تمام ضابطوں کی ایسی کھلی پامالی پر مشتمل ہے کہ جو کسی بھی شخص کے لیے روز قیامت سنگین ترین مسائل پیدا کر دے گی۔ ہوسکتا ہے میری ان گزارشات سے آپ خدا کے اس غضب پر کچھ متنبہ ہو جائیں جو مجرموں کی شکل بگاڑ دے گا۔

۲۔ آپ نے مجھ پر اپنا نام چھپانے کے حوالے سے بددیانتی کا سنگین ترین الزام لگایا ہے۔ مجھے

معلوم ہے کہ کچھ ابتدائی درجے کی عربی آپ کے ہاں پڑھتے پڑھاتے ہیں۔ یہ عربی کم از کم اتنی ضرور ہوتی ہے کہ انسان کو معلوم ہو جائے کہ ''ابو یحییٰ'' ایک کنیت ہے۔ علم و ادب اور زبان سے معمولی شناسائی رکھنے والا شخص بھی یہ کہنے کی حماقت نہیں کر سکتا کہ اپنی کنیت سے کتاب لکھنا یا اپنا تعارف کرنا اپنے آپ کو چھپانا ہے۔

میں مسلمانوں کی علمی تاریخ اور معاصر اہل علم و فن کی درجنوں مثالوں سے یہ بتا سکتا ہوں کہ یہ سب لوگ اپنی کنیت سے لکھا کرتے ہیں اور آج بھی لکھتے ہیں۔ کوئی اسے نام چھپانا نہیں کہتا۔ نام اس وقت چھپایا جاتا ہے جب نام نہ لکھا جائے یا پھر کسی اور نام سے لکھا جائے۔ مزید یہ کہ میں نے نہ یہ کتاب آپ کو تبصرے کے لیے بھیجی ہے اور نہ تعارف کے لیے اور نہ آپ کے کسی ساتھی کو کتاب پڑھنے کے لیے دی کہ اپنا تعارف کرانا میرا اخلاقی فرض بن جاتا۔ مگر آپ نے یہ سب کچھ جانتے بوجھتے مجھ پر بددیانتی کا الزام لگایا۔ مزید یہ کہ آپ نے میرے دل کا حال بھی جان لیا کہ میں نے کس وجہ سے یہ کتاب اپنی کنیت سے لکھی اور بڑے اعتماد سے اسے بیان کر دیا۔ ظاہر ہے کہ کوئی شخص جب نبی کی طرح فیصلہ دینے لگے تو اس کے لیے غیب دانی ضروری ہے۔ مگر کیا آپ کو یہ سوچنا نہیں چاہیے کہ قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ آپ کا احتساب کرتے ہوئے آپ سے پوچھیں گے کہ تم نے علم کے بغیر محض ذاتی اندازوں کی بنیاد پر میرے بندے پر بددیانتی کا الزام لگایا تو آپ کیا جواب دیں گے؟

اگر خدا اور آخرت نام کی کسی حقیقت کو آپ مانتے ہیں تو مجھے نہیں معلوم آج کے بعد آپ کو نیند کیسے آ جائے گی؟

۳۔ آپ نے مجھ پر یہ بہتان تراشا ہے کہ میں نے سلف صالحین سے تعلق کی نفی کی ہے۔ کمال یہ ہے کہ اس دعویٰ کے ثبوت میں میرا جو اقتباس آپ نے نقل کیا ہے اس میں سرے سے سلف

صالحین کا ذکر ہی نہیں نہ کسی پہلو سے ان سے کسی تعلق کی نفی کی گئی ہے۔آپ کا دیا ہوا اقتباس پڑھ کر واقعی آپ کے حوصلے کی داد دینی پڑتی ہے۔

اس کے بالکل برعکس حقیقت یہ ہے کہ ناول کے اس مرحلے پر مرکزی کردار عبداللہ جن لوگوں کے ساتھ موجود تھا وہ سب کے سب سلف صالحین ہی تھے۔ان کی عظمت کے احساس سے عبداللہ کو ان کے ساتھ شامل ہونے سے گریزاں دکھایا گیا ہے۔عبداللہ اپنی ساری خدمات کے باوجود ان بزرگوں کے ساتھ چلتے ہوئے بھی شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔ یہ ہے سلف صالحین کے متعلق میرا نقطہ نظر۔افسوس ہے آپ پر کہ آپ نے کیا پڑھا اور دوسروں کو کیا بتایا۔میرے بھائی اپنی تنظیم کے لوگوں کو میری کتاب پڑھنے اور پھیلانے سے روکنا تھا تو مجھ سے کہہ دیتے۔ میں کتاب پر لکھوا دیتا کہ آپ کی تنظیم کے لوگوں کے لیے اس کتاب کا پڑھنا منع ہے۔اس کے لیے بہتان تراشی کر کے اپنی آخرت کو داؤ پر لگانے کی کیا ضرورت تھی۔

اگر خدا اور آخرت نام کی کسی حقیقت کو آپ مانتے ہیں تو مجھے نہیں معلوم آج کے بعد آپ کو نیند کیسے آجائے گی؟

۴۔آپ نے ایک عنوان باندھا ہے کہ موسیقی جائز ہے۔اس کے ثبوت میں جنت کی زندگی کا ایک اقتباس بھی دیا ہے۔ غالباً آپ اپنے ان ضعیف الاعتقاد معصوم پیروکاروں پر یہ ثابت کرنا چاہ رہے ہیں کہ اس ملعون ابو یحییٰ نے بے پردگی کے ساتھ موسیقی جیسی حرام چیز کو بھی جنت میں داخل کر دیا۔ چہرے کے پردے پر میں نے اس لیے کوئی تبصرہ نہیں کیا کہ اول یہ علمی مسئلہ ہے اور علمی بحث نہ کرنے کا میں وعدہ کر چکا ہوں۔ دوسرا اس مسئلے میں آپ کے طعنے سہنے کے لیے میرے ساتھ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ اور امام ابوحنیفہ سے لے کر عصر حاضر کے امام ناصر الدین البانی جیسے ائمہ موجود ہیں جو چہرے کے پردے کے قائل نہیں۔

البتہ جنت میں موسیقی پر میں کچھ ضرور عرض کروں گا۔لیکن اس باب میں قرآن و حدیث سے میں ہرگز استنباط نہیں کروں گا کہ میں وعدہ کر چکا ہوں کہ آپ کو کسی علمی مشقت میں نہیں ڈالوں گا۔ اسلاف سے آپ کی محبت دیکھتے ہوئے آپ کو آگاہ کر رہا ہوں کہ جنت میں موسیقی ہوگی، یہ میرا نہیں اسلاف کا موقف ہے۔یہ بات امام طبری اور امام ابن کثیر نے اپنی تفسیروں میں آیہ مبارکہ ''فھم فی روضة یحبرون''، (اہل ایمان ایک شاندار باغ میں مسرور ہوں گے، روم 15:30) بیان کی ہے۔اب مجھے نہیں معلوم کہ قیامت کے دن خدا آپ کو اس جرات پر پکڑے گا کہ آپ نے علم کے بغیر کلام کیا یا اس پر کہ جانتے بوجھتے جھوٹ بولا۔

اگر خدا اور آخرت نام کی کسی حقیقت کو آپ مانتے ہیں تو مجھے نہیں معلوم آج کے بعد آپ کو نیند کیسے آجائے گی؟

۵۔اس پوری تنقید میں آپ نے مرد و خواتین کے تعلق کے حوالے سے بار بار مختلف پیرایوں میں اپنے معتقدین کو بھڑکانے کے لیے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ میں بے حیائی پر مبنی رویوں کو فروغ دینا چاہتا ہوں۔اس کوشش میں آپ شاید یہ بھول گئے کہ میں جنت کی پاک بستی اور نجات یافتہ پاکیزہ لوگوں کا ذکر کر رہا ہوں۔

تاہم آپ منفی ذہن سے باہر نکل کر کتاب کو پڑھتے تو آپ کو اندازہ ہوتا کہ کتاب میں کئی مقامات پر فحاشی اور بے حیائی کے رویوں کو میں نے زبردست تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔اس معاملے میں برسہا برس میں جو کچھ میں نے لکھا ہے دنیا بھر میں لوگ اسے پڑھتے اور پھیلاتے ہیں۔ میرا موقف اتنا مقبول ہے کہ آپ کی اپنی تنظیم کے لوگوں نے اس برس جب ویلنٹائن ڈے کے خلاف مہم چلائی تو اس عاجز کے کئی برس قبل لکھے ہوئے مضامین کو بنیاد بنایا۔شہر کے بڑے حصے کو جن بینروں سے بھر دیا گیا تھا ان پر بے حیائی کے خلاف لکھے ہوئے جملے یا تو پورے کے پورے

اس عاجز کی تحریروں سے لیے گئے تھے یا پھر ان کا مفہوم لیا گیا تھا۔ عدل وانصاف کا تقاضہ یہ تھا کہ آپ مجھے بدنام کرنے اور میرے خلاف مہم چلانے کے بجائے اس پورے تناظر میں حسن ظن سے کام لیتے یا مجھ سے براہ راست وضاحت طلب کرتے۔

مگر آپ نے اب یہ کر ہی دیا ہے تو میں سوال کرتا ہوں کہ یہی طریقہ واردات استعمال کر کے آپ اپنے کسی درس قرآن میں ولو اعجبك حسنهن (اے نبی آپ بیان کردہ خواتین کے علاوہ کسی اور سے نکاح نہیں کر سکتے چاہے ان کا حسن آپ کے لیے دل پسند ہو، احزاب 52:33) اور هولاء بناتی هن اطهر لکم (یہ میری بیٹیاں ہیں جو تمھارے لیے زیادہ پاکیزہ ہیں، ہود 78:11۔ عام قارئین کے لیے عرض ہے کہ یہ جملہ حضرت لوط علیہ السلام نے بستی کے اوباشوں سے اس وقت کہا جب ہوس میں اندھے ہو کر انہوں نے نوجوان لڑکوں کی طلب میں آپ کے گھر پر چڑھائی کر دی تھی: ابو یحییٰ) جیسی قرانی آیات پر بھی اسی طرح تبصرہ کیجیے جس طرح مجھ پر کیا ہے۔ اور حضرت لوط علیہ السلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بلکہ خود اللہ تعالیٰ پر بھی ٹھیک اسی طرح حملے کیجیے جس طرح اس فقیر پر کیے ہیں۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ ایک عادل انسان ایک جگہ ایک معاملہ کرے اور دوسری جگہ دوسرا معاملہ۔

میں اپنے لکھے ہوئے ایک ایک مقام کو لے کر یہ بیان کر سکتا ہوں کہ وہاں اصل بات کیا بیان ہو رہی تھی کس طرح آپ نے صرف مہم جوئی کے شوق میں ان کے غلط مطالب لیے ہیں۔ مگر میں چونکہ وعدہ کر چکا ہوں کہ آپ کو کسی علمی مشقت میں نہیں ڈالوں گا، اس لیے سر دست صرف سوال یہ ہے کہ قیامت کے دن آپ خلاف عدل وانصاف رویے کی کیا توجیہ اللہ کی بارگاہ میں پیش کریں گے؟

اگر خدا اور آخرت نام کی کسی حقیقت کو آپ مانتے ہیں تو مجھے نہیں معلوم آج کے بعد آپ کو نیند کیسے آجائے گی؟

۶۔ تنقید کرتے ہوئے آپ کے قلم میں اس مقام پر بڑی روانی آ گئی جب آپ حضرت یرمیاہ علیہ السلام کے تذکرے پر تنقید کر رہے تھے۔ میں نے چونکہ آپ کو علمی مشقت میں نہ ڈالنے کا وعدہ کر لیا ہے اس لیے میں ان کے ذکر کی وجوہات اور پس منظر سے صرف نظر کر کے آپ کی توجہ ایک اور حقیقت کی طرف دلانا چاہتا ہوں۔ آپ پورے جوش اور روانی سے جب یہ لکھ رہے تھے کہ عبداللہ کو حضرت موسیٰ اور حضرت ابراہیم علیہم السلام سے ملنے کی خواہش نہ ہوئی تو آپ یہ بھول رہے تھے کہ چند صفحات (صفحہ 38-37) قبل عبداللہ نہ صرف ان سے بلکہ دیگر کئی اور نبیوں سے مل کر آ رہا تھا۔

سوال یہ ہے کہ جس شخص کی یادداشت اور قوت مطالعہ اتنی کم ہو، اسے کیا حق ہے کہ وہ تنقید جیسے نازک میدان میں اترے اور اپنی اس کمزور یادداشت اور قوت مطالعہ میں کمی کی بنیاد پر ہدایت پھیلانے والی ایک کتاب پر تنقید کرے۔

ویسے مجھے یہ یادداشت کی کمزوری ہی محسوس ہوتی ہے کہ آپ ڈاکٹر اسرار مرحوم کی ان تمام پرانی تقریروں کو بھول چکے ہیں جن میں انہوں نے سورہ بنی اسرائیل کی ابتدائی آیات پر گفتگو کرتے ہوئے یہ واضح کیا تھا کہ بخت نصر کے دور میں بنی اسرائیل نے کیا فساد برپا کیا تھا اور کس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کو سزا دی تھی۔ اس وقت جو پیغمبر موجود تھے ان کا نام یرمیاہ علیہ السلام تھا۔ سارے بڑے مفسرین اس بات کو بیان کرتے ہیں۔ رہی ''سپر پاور کی غلامی سے نجات کی غیرت مندانہ جدوجہد'' جس کا آپ اپنی تنقید میں بڑے فخر سے ذکر فرما رہے ہیں، قرآن مجید سورہ بنی اسرائیل کی ابتدا میں ان کی حرکتوں کو فساد فی الارض کہتا ہے۔ اس عاجز نے یہ بات بیس پچیس برس قبل ڈاکٹر اسرار مرحوم ہی سے سمجھی تھی کہ بنی اسرائیل کے فساد کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے بخت نصر کے عذاب کا کوڑا ان کی پشت پر برسا دیا تھا۔

آپ کو شاید احساس نہیں آپ نے کتنے بڑے جرم کا ارتکاب کیا ہے۔آپ اس فقیر کو اپنے پیروکاروں کی نظر میں بے وقعت کرنے کے شوق میں آسمان و زمین کے مالک اور قرآن نازل کرنے والی ہستی کی نظر میں کس مقام پر آ چکے ہیں۔کوئی عام آدمی یہ کام کرتا تو شاید معافی کی کوئی گنجائش تھی۔مگر قرآن پڑھنے پڑھانے والا یہ کام کرے تو سوچ لینا چاہیے کہ معافی کی کیا گنجائش بچتی ہے۔ مجھے حیرت اس شخص پر ہے، جو جانتا ہو کہ بنی اسرائیل آیت 4 میں اللہ تعالیٰ حضرت یرمیاہ کے زمانے کے یہود کے عمل کو فساد فی الارض کہہ چکے ہیں اور وہ بدنصیب انسان اسے ''سپر پاور کی غلامی سے نجات کی غیرت مندانہ جدوجہد'' قرار دے رہا ہو۔مگر اس کریم کا کرم دیکھیے کہ اس فقیر کے ذریعے سے آپ کو توبہ کا ایک موقع دے دیا ہے۔میرے بھائی میں ہاتھ جوڑ کر درخواست کرتا ہوں کہ سوچیے !اللہ کے اس حقیر غلام کی مخالفت کے شوق میں آپ کہاں تک پہنچ گئے؟

اگر خدا اور آخرت نام کی کسی حقیقت کو آپ مانتے ہیں تو مجھے نہیں معلوم آج کے بعد آپ کو نیند کیسے آجائے گی؟

۷۔معاملہ یادداشت کی کمی تک رہتا تو شاید پھر کچھ گوارا تھا،مگر آپ کی یہ تنقید اس بات کا بھی واضح ثبوت ہے کہ آپ اپنے لکھے ہوئے الفاظ کو بھی نہیں پڑھ پاتے۔آپ فرماتے ہیں کہ میں نے اللہ کی راہ میں قتل ہونے والوں کے درجات یا اجر کا ذکر کہیں نہیں کیا۔لطف یہ ہے کہ صفحہ 75 پر میرا جو اقتباس آپ نے نقل فرمایا ہے اس کی ابتدا ہی میں یہ بیان ہوا کہ اللہ کی راہ میں قتل ہو جانے والے لوگ بھی بڑے اعلیٰ اجر کے حق دار ہوئے ہیں۔مگر کیا کیجیے انسان جب مخالفت کی نفسیات میں مبتلا ہو جائے تو اسے یہ بھی نظر نہیں آتا کہ وہ کیا لکھ رہا ہے اور کیا ثابت کر رہا ہے۔گرچہ ایسے لوگوں کو قرآن سنانے کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہوتا لیکن اتمام حجت کے لیے ان لوگوں کو قرآن کی آیت سنانا ضروری ہے جو دنیا بھر میں عدل اجتماعی قائم کرنے کے علمبردار ہیں:

''ایمان والو!انصاف پر قائم رہنے والے بنو، اللہ کے لیے اس کی شہادت دیتے ہوئے۔اور کسی قوم کی دشمنی تمھیں اس بات پر نہ ابھارے کہ تم عدل نہ کرو۔عدل کرو، یہ تقویٰ سے زیادہ قریب ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو۔بے شک اللہ تمھارے ہر عمل سے باخبر ہے۔''،(مائدہ 8:5)

اگر خدا اور آخرت نام کی کسی حقیقت کو آپ مانتے ہیں تو مجھے نہیں معلوم آج کے بعد آپ کو نیند کیسے آجائے گی؟

آخری بات صرف یہ ہے کہ جو اعتراضات آپ نے نقل کیے ہیں وہ صرف آپ اور آپ جیسے چند اور مہربانوں کے ذہن کی ایجاد ہیں۔عام لوگوں کے لیے تو اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کو اصلاح اور ہدایت کا ذریعہ بنا دیا ہے۔میں شیطان کے خلاف جنگ لڑ رہا ہوں۔آپ بھی اس کی نصرت وحمایت میں اترنا چاہتے ہیں تو مرحبا۔اللہ ہمارے فیصلہ کر دے گا۔میرا بھروسہ اسی پر ہے۔حسبنا اللہ و نعم الوکیل۔ نعم المولی و نعم النصیر ۔

بندہ عاجز

ابو یحییٰ

abuyahya267@gmail.com

(بدقسمتی سے اس کتاب کی اشاعت تک مجھے میرے خط کا جواب مجھے نہیں ملا۔حالانکہ یہ خط بذریعہ ٹی سی ایس ناقد موصوف کے ہاتھ میں اگلے دن پہنچ گیا تھا۔مگر حالات کی ستم ظریفی دیکھیے کہ اسی دوران میں انہی ناقد کے خلاف ایک مذہبی گروہ کی تنقید مجھے ای میل پر ملی۔اس میں ان صاحب کے سیاسی نظریات کو ''باطل'' قرار دے کر ان کا محاکمہ کیا گیا تھا۔یہ کیسا مقام عبرت ہے،ابو یحییٰ)

بنی اسرائیل اور مسلمان

(تیسری تحریر)

[یہ تحریر بھی ایک خط ہے جو بنی اسرائیل کی تاریخ کے کچھ واقعات کے حوالے سے ایک سوال کے جواب میں لکھا گیا۔ یہ واقعات میری کتاب ''جب زندگی شروع ہوگی'' میں بعض مقامات پر بیان کیے گئے تھے۔]

السلام علیکم ورحمت اللہ وبرکاتہ

امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔میری کتاب ''جب زندگی شروع ہوگی'' کے بارہویں باب یعنی ''بنی اسرائیل اور مسلمان'' کے بارے میں آپ کے سوالات کچھ بنیادی غلط فہمیوں پر مشتمل ہیں۔میں کوشش کروں گا کہ یہ غلط فہمیاں دور ہو جائیں۔

آپ کے اس سوال کے جواب میں کہ میرے ان بیانات کا اصل ماخذ کیا ہے، میں یہ عرض کروں گا کہ ان کا ماخذ سرتاسر قرآن مجید ہے۔قرآن مجید کی سورہ بنی اسرائیل کی آیت چار اور پانچ میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

''اور ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب میں اپنے اس فیصلے سے آگاہ کر دیا تھا کہ تم دو مرتبہ زمین میں فساد مچاؤ گے اور بہت سر اٹھاؤ گے۔پس جب ان میں سے پہلی بات کی میعاد آجاتی ہے تو ہم تم اپنے زور آور بندے مسلط کر دیتے ہیں تو وہ گھروں میں گھس پڑے اور شدنی وعدہ پورا ہو کے رہا۔''

قرآن مجید نے بنی اسرائیل کو یہ بات مخاطب ہو کر کہی تھی مگر تفصیل سے اس لیے صرف نظر

کیا کہ یہ ان کی تاریخ کے معلوم واقعات ہیں۔ان کا بچہ بچہ ان سے واقف تھا جیسے ہمارے ہاں لوگ ہلاکو خان کے ہاتھوں بغداد کی تباہی سے واقف ہیں۔تاہم ہمارے بڑے مفسرین جب اس مقام پر پہنچتے ہیں تو بنی اسرائیل کی تاریخ اور ان کے انبیا کے صحیفوں سے وہ پوری تفصیل بیان کرتے ہیں، جسے قرآن مجید نے دو جملوں میں بند کر دیا ہے۔

قدیم مفسرین کے ہاں اس کی تفصیل دیکھنی ہے تو تفسیر ابن کثیر سے رجوع کیجیے یا پھر تاریخ ابن کثیر کو دیکھیے جہاں ان تمام واقعات کی بڑی تفصیل کی گئی ہے۔اگر اس تفصیل کے ساتھ اس دور کے انبیاء کی تنبیہات کو بھی پڑھنا ہے تو مولانا مودودی کی تفہیم القرآن یا پھر مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کی قصص القرآن کا مطالعہ کیجیے جس میں وہ دیگر انبیا کے ساتھ بخت نصر (جس کے ہاتھوں بنی اسرائیل پر خدائی عذاب نازل ہوا) کے ہم عصر نبی حضرت یرمیاہ علیہ السلام کے مواعظ بھی نقل کیے گئے ہیں۔ان آیات میں کی گئی صراحت اور ان مفسرین کی بیان کردہ تفصیلات کے بعد یہ بات کہنا کہ اس یرمیاہ نبی کا نام ہمیں قرآن وحدیث میں دکھاؤ ورنہ ہم نہیں مانیں گے، صرف اس بات کا ثبوت ہے کہ اعتراض کرنے والا نہ قرآن مجید سے واقف ہے، نہ اصول تفسیر کو سمجھتا ہے اور نہ کسی بڑے عالم کی تفسیر اس نے زندگی میں کبھی پڑھی ہے۔

میں نے یہ تفصیلات پہلے دفعہ بیس برس قبل ڈاکٹر اسرار مرحوم کی مجلسوں میں بیٹھ کر سمجھی تھی۔ یہ تمام تقریریں اب تحریری شکل میں موجود ہیں۔میں ذیل میں صرف ایک تقریر کا اقتباس نقل کر رہا ہوں جس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے کیا بات فرمائی تھی۔

''بنی اسرائیل کی تاریخ کے اس دو ہزار سالہ دور کا جو نئی امت مسلمہ یعنی امت محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی سبق آموزی اور عبرت پذیری کے لیے کافی تھا' کمالِ فصاحت اور غایت اختصار کے ساتھ قرآن حکیم میں سورۂ بنی اسرائیل کے پہلے رکوع کی چھ (2 تا 7) اور

آخری رکوع کی چار (101 تا 104) یعنی کُل دس آیات میں بیان کر دیا گیا ہے، جس کا لبّ لباب یہ ہے کہ قرآن حکیم کے نزول کے زمانے تک بنی اسرائیل پر چار دور گزر چکے تھے: دودَورِ عروج کے، جن کے دوران ان کا طرزِ عمل بھی دینی و اخلاقی اعتبار سے درست رہا اور انہیں دنیا میں عزت و سربلندی بھی حاصل رہی اور وہ کثرتِ اموال و اولاد کی صورت میں اللہ تعالیٰ کے انعامات سے بھی بہرہ ور ہوتے رہے —— اور دو ہی دور زوال کے جن کے دوران انہوں نے نفس پرستی اور بغاوت کی روش اختیار کی، جس کے نتیجے میں ان پر اللہ کا غضب نازل ہوا اور غیر اقوام کے ہاتھوں وہ خود بھی ذلیل و خوار اور مفتوح و مغلوب ہوئے، اور ان کے دینی و روحانی مرکز یعنی ہیکلِ سلیمانی کی حرمت بھی پامال ہوئی۔ تاہم اگر اس کی کسی قدر وضاحت تاریخی اور زمانی ترتیب کے ساتھ کی جائے تو وہ حسب ذیل ہے:

1) ان کے پہلے دورِ عروج کا آغاز حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلیفۂ اوّل حضرت یوشع بن نون کی قیادت میں فلسطین کی فتح سے ہوا، اور تقریباً تین سو سال تک نشیب و فراز کے مراحل طے کرتا ہوا یہ دورِ سعادت حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کے عہدِ حکومت میں اپنے نقطۂ عروج کو پہنچا، جو تاریخ بنی اسرائیل کے عہدِ زریں کی حیثیت رکھتا ہے۔

2) حضرت سلیمان علیہ السلام کے انتقال کے ساتھ ہی ان کے پہلے دورِ زوال کا آغاز ہو گیا، اس لیے کہ فوراً ہی سلطنت دو حصوں میں منقسم ہو گئی۔ بہرحال تقریباً تین سو سال ہی میں عہدِ زوال بھی اپنی انتہا کو پہنچ گیا۔ چنانچہ اولاً شمال سے آشوریوں نے شمالی سلطنت اسرائیل کو تاخت و تاراج کیا اور بالآخر 587 قبل مسیحؑ میں مشرق (عراق) سے آنے والے بخت نصر (Nebukadnezar) کے حملے نے نہ صرف یہ کہ پوری جنوبی سلطنت یہود یہ کو تہس نہس کر کے رکھ دیا بلکہ یروشلم کی اینٹ سے اینٹ بجادی، لاکھوں افراد کو قتل کیا، چھ لاکھ یہودی مردوں، عورتوں اور بچوں کو بھیڑوں اور بکریوں کے گلوں کی طرح ہانکتا ہوا بابل لے گیا —— اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہیکل سلیمانی کو کلیۃً مسمار کر دیا،

حتیٰ کہ اس کی بنیادیں تک کھود ڈالیں! —— بابل کی لگ بھگ سو سالہ اسیری کا دور بنی اسرائیل کی ذلت و رسوائی کا شدید ترین زمانہ ہے۔ (صفحہ نمبر 30-29)

(بحوالہ کتاب: سابقہ اور موجودہ مسلمان امتوں کا ماضی، حال اور مستقبل اور مسلمانانِ پاکستان کی خصوصی ذمہ داری —— ڈاکٹر اسرار احمد)

مذکورہ بالا تحریر اور خاص کر خط کشیدہ الفاظ کو دوبارہ پڑھیے جو خلاصے کہ حیثیت رکھتے ہیں اور مجھے صرف یہ بتا دیجیے کہ میں نے اس سے مختلف کیا بات لکھی ہے۔ یہ بھی ڈاکٹر اسرار مرحوم ہی کا موقف ہے جسے انہوں نے پوری قوت سے پیش کیا کہ بنی اسرائیل جس طرح دو دفعہ عذاب کی زد میں آئے اسی طرح مسلمانوں کے ساتھ ہوا اور اس وقت بھی مسلمان حالت عذاب میں ہیں، (وہ کہتے ہیں، ''اس وقت ہم بحیثیت امت عذاب الٰہی کی گرفت میں ہیں۔''، حوالہ بالہ صفحہ 13)۔ جس کتاب کا میں نے حوالہ دیا ہے اس کا موضوع ہی یہی ہے۔

امید ہے کہ آپ کے اشکالات دور ہو گئے ہوں گے۔

ابو یحییٰ

abuyahya267@gmail.com

''اور شاعروں کی پیروی گمراہ لوگ کرتے ہیں۔ کیا وہ نہیں دیکھتے کہ وہ ہر وادی میں بھٹکتے ہیں؟ اور وہ کہتے ہیں جو کرتے نہیں۔ بس وہ لوگ اس سے مستثنیٰ ہیں جو ایمان لائے، جنھوں نے نیک اعمال کیے، جنھوں نے اللہ کو زیادہ سے زیادہ یاد کیا اور جنھوں نے بدلہ لیا بعد اس کے کہ ان پر ظلم ہوا''، (الشعراء 26:224-227)

نظریہ سازش اور الزامی سوچ کی حقیقت

(چوتھی تحریر)

[اس کتاب کی مناسبت سے قارئین کے سامنے میں اپنی ایک پرانی تحریر پیش کرنا چاہتا ہوں۔ یہ تحریر اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ اس سے قارئین کو اندازہ ہو جائے گا کہ کس طرح بڑے اہل علم اور زمانے کو متاثر کرنے والی شخصیات کے خلاف پورے اعتماد سے پروپیگنڈا کیا جاتا ہے۔ میرے لیے اس تحریر کی اہمیت یوں بہت زیادہ ہے کہ میں نے اپنے بریلوی پس منظر کی بنا پر انہیں گستاخ رسول سمجھ کر زندگی میں سب سے زیادہ شیخ محمد بن عبدالوھاب اور ان کے پیروکاروں ہی سے نفرت کی۔ مگر اس تحریر میں شیخ کا دفاع کر کے میں نے اپنے اس گناہ کا مداوا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہماری خطاؤں کو درگزر فرمائے۔ ابو یحییٰ]

ایک جاسوس کی چشم کشا سرگزشت

حال ہی میں ایک معروف مورخ اور کالم نگار نے روزنامہ جنگ میں ایک جاسوس کی چشم کشا سرگزشت کے عنوان سے تین کالم لکھے۔ یہ کالم ایک برطانوی جاسوس ہمفرے کی ڈائری کے حوالے سے ہے۔ ڈائری یا کتاب میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اس جاسوس نے اٹھارہویں صدی کے آغاز پر کس طرح مسلمانوں میں انتشار اور افتراق کا بیج بویا۔

نظریہ سازش پر مبنی اس طرح کی چیزوں پر قلم اٹھانا ہماری دلچسپی کا میدان نہیں، مگر روزنامہ جنگ جیسے اخبار میں اس کتاب کا ذکر آجانے کے بعد یہ بات لازمی ہے کہ لوگوں کی ایک بڑی

تعداد نے زیر تبصرہ کتاب کو انٹرنیٹ پر پڑھ لیا ہوگا۔ ہمارے لیے یہ بات بھی اہم نہیں، مگر سوئے اتفاق کہ اس کتاب میں دور جدید کے ایک بہت بڑے مصلح کو جس حیثیت میں پیش کیا گیا ہے اور ان کی کردار کشی کرتے ہوئے انہیں ایک زانی، شرابی کے طور پر دکھایا گیا اور ان کے پورے اصلاحی کام کو برطانوی ایجنڈا قرار دیا گیا ہے، اس کی بنا پر ضروری ہے کہ کچھ امور پر اب توجہ دلائی جائے۔

نظریہ سازش

فاضل کالم نگار نے خوف فساد خلق سے ان مصلح کا نام نہیں لکھا لیکن سارے واقفان حال جانتے ہیں کہ اصل کتاب میں شیخ محمد بن عبدالوہاب اور ان کے کام کی اخلاقی حیثیت کو بری طرح مجروح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہمارے لیے ایک مصلح تو کیا ایک عام مسلمان کی طرف بھی اس طرح کی چیزوں کی نسبت کرنے کی کوئی گنجائش نہیں، مگر ہمارے ہاں نظریہ سازش اس طرح فروغ پا چکا ہے کہ لگتا ہے کہ لوگ ایسی باتوں کو سننے اور بغیر تصدیق کے ماننے کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔ چنانچہ فاضل کالم نگار نے غالباً کسی بری نیت سے نہیں بلکہ اسی نظریہ سازش کو قبول کرتے ہوئے بہت اطمینان سے اس کتاب پر تین کالم لکھ ڈالے جس کا اپنا متن پکار پکار کر یہ بتا رہا ہے کہ یہ سرتاسر ایک جعلسازی ہے۔ فاضل کالم نگار جو خود ایک مورخ ہیں بڑے اعتماد سے کالم کے آغاز پر فرماتے ہیں۔

> ''میں چونکہ بنیادی طور پر تاریخ کا طالب علم ہوں اس لیے اس کتاب کے مطالعے نے مجھے تھوڑا سا حیران کر دیا۔ حیرانی کے اس عالم میں کتاب میں بیان کیے گئے واقعات کی تصدیق دوسرے واقعات سے کی تو راز کھلا کہ اس میں بیان کیے گئے واقعات وحالات کافی حد تک درست ہیں۔''

ایک مورخ جب اس طرح کی بات کہہ دے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ زیر بحث

کتاب کو وہ سند تصدیق عطا کر رہا ہے۔ حالانکہ اس کتاب میں تاریخی واقعات بہت کم اور ہمفرے نامی جاسوس کے وہ واقعات زیادہ بیان ہوئے ہیں جو اس کی ذاتی روداد ہے۔ ایک تو ذاتی روداد اور وہ بھی ایک جاسوس کی جس کی ساری سرگرمیاں بالکل خفیہ ہوتی ہیں، اس بات کی کوئی گنجائش ہی نہیں چھوڑتی کہ دیگر تاریخی واقعات سے ان کی تصدیق کی جا سکے۔

کتاب میں موجود تاریخی غلطیاں

تاہم اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اس کتاب میں جو اہم ترین تاریخی باتیں بیان ہوئیں وہ آخری درجے میں کتاب کی سچائی کو مشکوک کر دیتی ہیں۔ ہم ان میں سے دو کا ذکر کریں گے۔ ان میں سے پہلی بات عالمی سیاسی حالات کے بارے میں ہے۔ کتاب کے آغاز میں ہمفرے کہتا ہے۔

Our Great Britain is very vast. The sun rises over its seas, and sets, again, below its seas. Our State is relatively weak yet in its colonies in India, China and Middle East.

ترجمہ:

''ہمارا عظیم ملک برطانیہ بہت وسیع و عریض ہے۔ سورج اس کے سمندروں پر طلوع ہوتا اور اسی کے پانیوں پر غروب ہو جاتا ہے۔ تاہم ہماری مملکت انڈیا، چین اور مشرق وسطیٰ میں قائم اپنی نوآبادیوں میں قدرے کمزور ہے۔''

یہ پہلے باب کا آغاز تھا اور دوسرے باب کے آغاز پر یہی صاحب اس زمانے کا تعین بھی خود ہی کر رہے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے۔

In the Hijree year 1122, C.E. 1710, the Minister of Colonies sent me to Egypt, Iraq, Hidjaz and Istanbul to act as a spy and to obtain information necessary and sufficient for the breaking up of Muslims.

ترجمہ:

''سن 1122 ہجری، 1710 عیسوی میں وزارت نوآبادیات نے مجھے مصر، عراق، حجاز اور استنبول میں بطور جاسوس کام کرنے اور وہ معلومات حاصل کرنے کے لیے روانہ کیا جو مسلمانوں کا شیرازہ بکھیرنے کے لیے ضروری تھیں۔''

دو اور دو چار کی طرح اس کا مطلب یہ ہے کہ جس زمانے میں سورج برطانیہ کے پانیوں سے طلوع ہو کر اسی کے سمندروں میں غروب ہوتا تھا اور مشرق وسطیٰ، چین اور ہندوستان برطانیہ کالونیاں بن چکے تھے، وہ 1710 عیسوی یا اس کے کچھ بعد کا زمانہ ہے۔ تاریخ کا معمولی علم رکھنے والا شخص بھی یہ سمجھ سکتا ہے کہ یہ بات خلاف واقعہ ہے، کجا یہ کہ برصغیر کی تاریخ کا ایک معروف مورخ اتنی موٹی بات کو نہ سمجھ سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ 1710 سے صرف تین برس قبل یعنی 1707 تک اورنگزیب عالمگیر متحدہ برصغیر کے 1250 ملین مربع میل اور دنیا کی ایک چوتھائی آبادی پر پورے دبدبے کے ساتھ حکومت کر رہا تھا۔ اس واقعے کے کم و بیش نصف صدی بعد برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کو 1757 میں جا کر بنگال میں سراج الدولہ کے مقابلے میں پہلی فتح حاصل ہوتی ہے۔ پھر اس کے ایک صدی بعد 1857 کی جنگ آزادی کے بعد ہی ہندوستان رسمی طور پر تاج برطانیہ کے زیر نگیں آیا۔ جبکہ مڈل ایسٹ میں برطانیہ کا اقتدار سب سے پہلے مصر میں 1882 میں قائم ہوا۔ رہا چین تو یہ 1842 میں ہوا کہ چین کا

جزیرہ ہانگ کانگ برطانیہ کے زیر انتظام آیا اور چین میں پہلی برطانوی نوآبادی قائم ہوئی۔

شیخ محمد بن عبدالوھاب سے متعلق ایک تاریخی غلطی

اس تفصیل سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ یہ ایک تاریخی جھوٹ ہے کہ اٹھارہویں صدی کے آغاز پر برطانوی کالونیاں مشرق وسطیٰ، چین اور ہندوستان میں قائم ہوچکی تھیں۔ یہ اصل میں انیسویں صدی کا واقعہ ہے جسے غلط طور پر اٹھارہویں صدی کے آغاز کی طرف منسوب کردیا گیا ہے۔ اب آیئے دوسری بات کی طرف۔ ہمفرے کے حوالے سے کتاب میں یہ بات بیان ہوئی ہے کہ وہ 1710 میں استنبول گیا۔ دوسال وہاں رہا اور ایک سال کے بعد بصرہ پہنچا۔ اس طرح یہ سن 1712 یا س 1713 کے لگ بھگ کا زمانہ تھا۔ بصرہ میں اس کی ملاقات شیخ سے ہوئی۔ ہمفرے کے مطابق شیخ عربی، فارسی اور ترکی روانی سے بول رہے تھے۔ عثمانیہ خلافت کے خلاف باغیانہ خیالات کی ترویج کررہے تھے۔ دینی معاملات پر مروجہ تصورات کے خلاف سخت تنقیدیں کرتے تھے۔ علمی بحث ومباحثہ کررہے تھے۔ ہمفرے نے ان سے دوستی کی اور جلد ہی انہیں ایک عورت سے متعہ پر آمادہ کرلیا اور وہ شراب بھی پینے لگے۔

قارئین کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ شیخ اپنے آبائی وطن سے ہزاروں میل دور جب یہ سب کچھ کررہے تھے تو ان کی عمر مصدقہ تاریخ کے مطابق صرف 9 یا 10 سال کی تھی۔ انا للہ وہ انا الیہ راجعون۔ تاریخی طور پر شیخ کا سن پیدائش 1703 یا 1704 بیان کیا جاتا ہے۔ چنانچہ 1713 میں ان کی عمر صرف نو یا دس برس ہونی چاہیے۔ خیال رہے کہ مصدقہ تاریخی حوالوں کے مطابق بصرہ آنے سے قبل شیخ حجاز اور خاص کر مدینہ میں رہ کر علم کی تحصیل بھی کرتے رہے۔ اس لیے مورخین عام طور پر یہ بات بیان کرتے ہیں کہ بصرہ کا سفر شیخ نے اس وقت کیا جب ان کی عمر بیس برس سے اوپر کی تھی۔ یعنی یہ واقعہ 1723 کے بعد کا ہے، اس سے پہلے کا نہیں۔

یہ ہے ہمفرے کے دعووں کی حقیقت جس کی بنیاد پر یہ مکروہ پروپیگنڈا کیا جارہا ہے۔ ان دو واقعات کی روشنی میں اس کتاب کی صحت اور عدم صحت کا فیصلہ باآسانی کیا جاسکتا ہے۔ اسی نوعیت کی اور کئی تاریخی غلطیاں بھی اس کتاب میں پائی جاتی ہیں۔ ان کی تفصیل درج ذیل لنک پر ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

http://www.islamicawakening.com/

viewarticle.php?articleID=1105&pageID=439&

دو توجہ طلب چیزیں

تاہم ہمارے نزدیک اصل توجہ طلب چیزیں دو ہیں۔ ایک یہ کہ ہماری قوم ہر معاملے میں نظریہ سازش قبول کرنے کے لیے ہمہ وقت کیوں تیار رہتی ہے؟ یہ معاملہ اس حد تک پہنچ چکا ہے کہ ایک مورخ بھی سوچے اور تحقیق کیے بغیر اطمینان سے لاکھوں لوگوں کو اس سازش کی اطلاع دے دیتا ہے۔ جب ایک مورخ کا یہ حال ہے تو عوام الناس کا معاملہ تو جانے دیجیے۔ اہل علم کا معاملہ تو یہ ہونا چاہیے کہ وہ لوگوں کو سچائی سے آگاہ کریں۔ اور سچائی یہ ہے کہ آج مسلمانوں کی ذلت اور بدحالی میں کسی سازش سے زیادہ علم واخلاق میں ان کی پستی بنیادی وجہ بنی ہوئی ہے۔ اور تعصب اور جہالت ان کے بیشتر مسائل کی جڑ ہے۔ یہی ہماری بربادی کا اصل سبب ہے۔

دوسری توجہ طلب چیز یہ ہے کہ بدقسمتی سے اس کتاب کو سلفی نقطہ نظر کے مخالفین نے بہت پھیلایا ہے اور متعدد زبانوں میں اس کے ترجمے کیے گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ چیز شیخ سے حسن ظن رکھنے والوں اور ان کے معتقدین کے لیے بڑی تکلیف دے ہوگی۔ لیکن اصل سانحہ یہ ہے کہ شیخ کے اپنے نام لیوا خاص کر برصغیر میں ان سے متاثر مسلمانوں کے دو بڑے گروپ یعنی اہل حدیث اور دیوبندی حضرات یا ان سے متاثر اہل علم اور تنظیمیں بھی اپنے سے مختلف نقطہ نظر رکھنے والے اہل علم کے ساتھ کچھ زیادہ مختلف معاملہ نہیں کرتے۔ میں بعض اہل علم کے خلاف چلنے والی مہموں کی

تفصیلات اگر یہاں بیان کردوں تو قارئین یہ جان کر حیرت زدہ رہ جائیں گے کہ ان مہموں اور ''ہمفرے کے انکشافات'' میں کوئی فرق نہیں۔ سوال یہ ہے کہ پھر ان میں اور ان کے اکابرین کے خلاف پروپیگنڈا کرنے والوں میں اخلاقی طور پر کیا فرق باقی رہ جاتا ہے۔ ایسا کرنے والے صالحین کا تو کچھ نہیں بگاڑ سکتے کہ پروردگار عالم اپنے صالح بندوں کو ہر حال میں ایسے الزام و بہتان سے بچالیتا ہے، مگر الزام لگانے والے یقیناً اس عمل میں اپنی آخرت کھودیں گے۔

رہی دنیا تو ایسی بے سروپا مہموں سے نہ شیخ کے نقطہ نظر کی مقبولیت میں کمی آئی ہے نہ دیوبندی اکابرین کے خلاف کفر وارتداد کے فتووں سے کچھ فرق پڑا ہے۔ نہ مولانا مودودی کی عظمت میں کوئی کمی آئی ہے۔ اس لیے ان سب کے پیروکار اگر یہ سمجھتے ہیں کہ دوسرے اہل علم اور مصلحین کے خلاف جھوٹی مہمیں چلا کر ان کا راستہ روکا جاسکے گا تو یہ ایک غلط فہمی ہے۔ زیادہ وقت نہیں گزرے گا کہ یہ غلط فہمی دور ہوجائے گی۔ یہ وہ وقت ہوگا جب روز قیامت قرآن مجید ان کے خلاف کھڑے ہوکر گواہی دے گا۔ وہ اللہ کا حکم یوں سنائے گا:

''ایمان والو! اللہ کے لیے کھڑے ہوجاؤ، انصاف کی گواہی دیتے ہوئے اور کسی قوم کی دشمنی بھی تمھیں اس بات پر نہ ابھارے کہ انصاف سے پھر جاؤ۔ انصاف کرو، یہ تقویٰ سے زیادہ قریب ہے۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ بے شک، اللہ تمھارے ہر عمل سے باخبر ہے۔'' (مائدہ 8:5)

اس روز ہر جھوٹے، بہتان طراز اور سنی سنائی بات آگے پھیلانے والے کو معلوم ہوجائے گا کہ وہ دنیا میں اللہ کے لیے نہیں بلکہ اپنے فرقے کے لیے کھڑا ہوا تھا۔ اس لیے کہ جو اللہ کے لیے کھڑے ہوتے ہیں وہ تہذیب کے ساتھ اختلاف تو کرسکتے ہیں، مگر کبھی عدل وانصاف سے ہٹ کر کسی کے ساتھ معاملہ نہیں کرتے۔ چاہے وہ ان کا دشمن ہی کیوں نہ ہو۔

حرم پاک اور مسلمانوں کا تفرقہ

(پانچویں تحریر)

[''جب زندگی شروع ہوگی'' کی تصنیف کے بعد اللہ تعالیٰ نے حرمین شریفین کی زیارت کی سعادت عطا فرمائی۔ اس سفر کی روداد میں نے قلمبند کی تھی۔ مکہ کے قیام کے دوران کا ایک حصہ جس کا تعلق مسلمانوں کے فرقہ وارانہ اختلافات سے ہے قارئین کی نذر ہے۔ اس وقت میری کتاب پر کوئی تنقید سامنے نہیں آئی تھی لیکن اصل مسئلہ یعنی مسلمانوں کا تفرقہ چونکہ میرے دل کا درد ہے اس لیے اس کی عکاسی اس تحریر میں مکمل طور پر نظر آئے گی۔]

تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

مسجد الحرام میں حرم پاک کے علاوہ جو سب سے زیادہ خوبصورت منظر ہوتا ہے وہ مسلمانوں کا مل کر اپنے رب کی عبادت کرنا ہے۔ حرم کا طواف کرتے، احرام میں ملبوس سعی کرتے اور نماز باجماعت کے وقت ہر رنگ ونسل، ہر زبان وجغرافیہ کے مرد وعورت اپنا ہر فرق بھلا کر یک جان ہوجاتے ہیں اور زبان حال سے دنیا کو یہ پیغام دیتے ہیں کہ ہمارا رب ایک ہے اور ہم ایک ہی آدم وحوا کی اولاد ہیں۔ وحدت رب اور وحدت آدم کا یہ پیغام دنیا میں کسی اور کے پاس نہیں ہے۔

مگر بدقسمتی سے مسلمانوں کے اندر موجود عدم برداشت نے ان کے فرقہ وارانہ اختلافات کو بہت بڑھا دیا ہے۔ خاص کر برصغیر پاک وہند میں یہ اختلافات، فتووں اور مناظروں سے گزر کر اپنے سے اختلاف رکھنے والوں کو قتل کرنے، ان کی مساجد پر حملہ کرنے انھیں بدنام کرنے کی

باقاعدہ مہموں تک جا پہنچے ہیں۔

مجھے اس المیے کا احساس اس لیے بھی بہت زیادہ ہوا کہ اسی سفر کے دوران ایک روز جدہ میں میں نے اپنی ای میل چیک کی تو مجھے ہندوستان کے ایک معروف عالم ڈاکٹر ذاکر نائیک کے خلاف ایک خاص مکتبہ فکر سے متعلق لوگوں کی ایک ای میل وصول ہوئی۔ مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں کہ کسی عالم سے اختلاف کیا جائے۔ اختلاف صرف پیغمبر سے نہیں ہوسکتا باقی سب عام انسان ہوتے ہیں۔ مگر یہ اختلاف عناد تک پہنچ جائے۔ کسی شخص کو مجموعہ شر سمجھ کر اس کو بدنام کرنے کی باقاعدہ مہم چلائی جائے، جس کے نتیجے میں مذہبی دہشت گردی کے اس دور میں اس کی جان کو خطرہ ہو جائے، ایک ایسا رویہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کبھی مقبول نہیں ہوسکتا۔

برصغیر میں فرقہ وارانہ تنازعے کی تاریخ

المیہ یہ ہے کہ آج کل فتویٰ سازی اور دوسروں کو بدنام کرنے کی یہ فیکٹریاں زیادہ تر ان لوگوں نے لگا رکھی ہیں جو سب سے پہلے خود اس زیادتی کا شکار ہوئے تھے۔ میری یہ بات تھوڑی تفصیل چاہتی ہے جو قارئین کے لیے دلچسپ نہ سہی عبرت ناک ضرور ہوگی۔

برصغیر میں مذہبی اختلاف کی شدت اس وقت نمایاں ہوئی جب عالم عرب میں شیخ محمد بن عبدالوھاب کی اصلاحی تحریک کے اثرات ہندوستان تک پہنچنے شروع ہوئے۔ یہ تحریک بنیادی طور پر رد شرک و بدعات کی تحریک تھی جس نے اپنے بہت سے نقائص اور افراط وتفریط کے باوجود مجموعی طور پر اس مقدس سرزمین کو توحید کے اس پیغام کا نمونہ بنا دیا جسے لے کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم آئے تھے۔ ہندوستان میں شاہ ولی اللہ کے خانوادے اور ان کے متعلقین خاص کر سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ نے اس پیغام کو لے کر ہندوستان میں اصلاحی عمل شروع کیا۔ آہستہ آہستہ یہ فکر عام ہونا شروع ہوئی اور اس نے عوام وخواص کو متاثر کرنا شروع

کیا۔ یہ اصلاحی عمل دو دھاروں میں بٹ گیا۔ ایک وہ جو مکمل طور پر عرب کا اثر قبول کر کے خود کو سلفی یا اہل حدیث کہلانے لگے اور ان کے مخالفین انھیں شیخ محمد بن عبدالوھاب کی نسبت سے وہابی کہنے لگے۔ جبکہ دوسرا نقطہ نظر وہ تھا جس نے فقہ اور تصوف کے معاملے میں ہندوستان کے مروجہ نقطہ نظر ہی کو اختیار کیا اور حنفی اور صوفی شناخت باقی رکھتے ہوئے اصلاح کو قبول کیا۔ یہ لوگ مدرسہ دیوبند کی نسبت سے دیوبندی کہلائے۔ اس اصلاحی عمل میں کچھ تو افراط وتفریط بھی ہوا اور فطری طور پر کچھ مخالفت مروجہ نقطہ نظر کے اہل علم کی طرف سے ہونی ہی تھی سو وہ شروع ہوئی۔ ایسے میں برصغیر میں مروجہ نقطہ نظر کو مولانا شاہ احمد رضا خان صاحب فاضل بریلوی جیسا جینئس اور جید عالم مل گیا۔ انھوں نے ایک طرف اصلاح کی اس تحریک میں اپنا حصہ ڈالا اور بہت سے صریح مشرکانہ اعمال جیسے قبروں کو سجدہ کرنے وغیرہ کے خلاف آواز اٹھائی، مگر اس کے ساتھ ہی انھوں نے نئے پیدا ہونے والے مکاتب فکر کے اثرات کا مقابلہ کرنے کی زبردست کوششیں کیں۔ خاص کر بارگاہ رسالت کے ادب اور محبت کو موضوع بنا کر اکابرین دیوبند اور اہل حدیث حضرات پر زبردست تنقیدیں کیں۔ ان کی نسبت سے مروجہ نقطہ نظر کے حاملین بریلوی کہلائے جن کے ہاں دیوبندی اور اہل حدیث حضرات کے لیے گستاخ رسول اور منکر درود کی اصطلاحات آج بھی عام استعمال ہوتی ہیں۔ شیخ محمد بن عبدالوھاب کا تعلق چونکہ عرب کے علاقے نجد سے تھا اس پس منظر میں مولانا شاہ احمد رضا خان بریلوی کی ایک مشہور نعت کا شعر آج بھی محافل نعت میں زور وشور سے پڑھا جاتا ہے۔

اور تم پر مرے آقا کی عنایت نہ سہی
نجدیوں کلمہ پڑھانے کا بھی احسان گیا

جبکہ بعض نعت خواں شعر کو زیادہ حسب حال بنانے کے لیے دوسرے مصرعے میں ترمیم

کر کے شعر اس طرح پڑھتے ہیں:

اور تم پر مرے آقا کی عنایت نہ سہی

''منکرو'' کلمہ پڑھانے کا بھی احسان گیا

یہاں منکر سے مراد ''منکر درود'' ہے۔ صحیح غلط کی بحث سے قطع نظر بریلوی حضرات کے ہاں یہ اصطلاح اہل حدیث اور دیوبندی حضرات کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ خیر اسی عمل میں مولانا رضا نے دیوبندی حضرات کے بعض نمائندہ اور جلیل القدر علماء مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا خلیل احمد سہارن پوری کو نبوت کا دعویٰ کرنے والے مرزا غلام احمد قادیانی کے ساتھ ایک ہی صف میں کھڑا کر کے ان کے خلاف کفر کا فتویٰ دیا۔ بعد میں انھوں نے علمائے حجاز سے اپنے فتوے کی توثیق کروالی۔ ان علما کے علاوہ اہل حدیث کے نمائندہ عالم شاہ اسماعیل پر ان کی کتاب 'تقویۃ الیمان'' کی بعض عبارتوں کی بنیاد پر پہلے ہی کفر کا فتویٰ آچکا تھا۔

کل کے مظلوم آج کے ظالم

یہ وہ پس منظر ہے جس میں دیوبندی اور اہل حدیث حضرات کے خلاف ایک زبردست ردعمل پیدا ہوا۔ اس دور میں اس ردعمل کی شدت کا اندازہ کرنا ہے تو مولانا ابوالکلام کی حالات زندگی کے حوالے سے دستیاب مواد کا مطالعہ کیجیے..... خیر اب مطالعہ کرنے کا وقت کس کے پاس ہوگا۔ میں بطور نمونہ ان کی سوانح حیات کا ایک چھوٹا سا واقعہ پیش کر دیتا ہوں تا کہ اس ظلم کا کچھ اندازہ ہو سکے جو اُس دور کے اصلاح پسندوں کے ساتھ ہو رہا تھا۔

ابوالکلام کے استاد ایک روایت پسند تھے۔ ان کے علاقے میں کوئی بے چارہ آ گیا جو یہ کہتا پھر رہا تھا کہ شب برات کا حلوہ کھانا ناجائز ہے۔ انہوں نے ملازموں سے اسے پکڑ کر بلوالیا اور صحن میں مرغا

بنوا کر اس کے جوتے لگوانا شروع کر دیے۔ ہر جوتے پر وہ غالباً اپنا ہی تخلیق کردہ یہ شعر پڑھتے جاتے۔

وہابی بے حیا جھوٹے ہیں یارو

تڑا تڑ جوتیاں تم ان کو مارو

بہر حال اس طرح کے ظلم سے افکار اور تحریکیں نہیں رکا کرتے۔ چنانچہ آج اہل حدیث اور دیوبندی حضرت اپنی جگہ موجود ہیں۔ تاہم اصل سانحہ یہ ہے کہ خود انھوں نے نئے اہل علم کے خلاف کم وبیش یہی رویہ اختیار کر لیا۔ اس کی ایک مثال مولانا مودودی ہیں جنھیں بڑے پیمانے پر بدنام کرنے کی مہم چلائی گئی اور ان کی بعض تحریروں اور ان کی شخصیت کے خلاف زبردست پروپیگنڈہ کیا گیا۔ اس پروپیگنڈے کی تفصیل اب تاریخ کا حصہ ہے یا پھر ان انٹرنیٹ ویب سائٹ کا جو آج بھی ''فتنہ مودودیت'' کے خلاف کام کر رہی ہیں، مگر میں قارئین کی دلچسپی کے لیے صرف ایک واقعہ نقل کر رہا ہوں۔ ایک دفعہ ایک عالم نے کسی جلسے میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ مودودی کو ڈالروں سے بھری ہوئی بوریاں امریکہ سے ملتی ہیں۔ مولانا کے سامنے اس بات کو بیان کیا گیا تو کمال شگفتگی سے بولے: امریکی ڈالر مجھے دیتے ہیں اور وصولی کی رسید ان صاحب کو بھجوا دیتے ہیں۔

ستم ظریفی یہ ہے کہ مولانا کے اپنے نام لیواؤں کی ایک بڑی تعداد کا رویہ نئے اہل علم کے متعلق کچھ زیادہ مختلف نہ ہو سکا۔ معلوم نہیں لوگ تاریخ سے کیوں نہیں سیکھتے۔ امام ابوحنیفہ کو ان کے زمانے میں کس بے رحمی کے ساتھ طعن وتشنیع کا نشانہ بنایا گیا، مگر آج ہر گردن امام اعظم کے سامنے جھکی ہوئی ہے۔ امام ابن تیمیہ کو گستاخ رسول قرار دیا گیا اور کمال یہ ہے کہ پاکستان میں گستاخی رسول کے خلاف جو قانون بنایا گیا اس میں فقہ حنفی کے پیروکاروں نے اپنے امام اعظم کے نقطہ نظر کو چھوڑ کر امام ابن تیمیہ کے نقطہ نظر کو اختیار کر لیا۔ مولانا مودودی کو ان کی زندگی میں کیا کچھ نہیں کہا گیا، مگر آج دیکھیے کہ ان کے مخالفین بھی کئی معاملات میں اپنا کلاسیکل نقطہ نظر چھوڑ کر

ان کی بولی بولتے ہیں۔فاعتبروا یا اولی الابصار ۔جب کسی کے مرنے کے بعد یہ سب کچھ کرنا ہی ہے تو اُس کی زندگی میں اسے برداشت بھی کرلیا کریں۔

بہرحال میرے نزدیک ہمارے حالات کی خرابی، مذہبی دہشت گردی اور فرقہ بندی کی وجہ یہی عدم برداشت پر مبنی رویہ ہے۔اس میں اصولی اور علمی اختلاف کے بجائے دوسروں کو بدنام کرنے پر زیادہ زور ہوتا ہے اور جس میں جھوٹ، الزام، بہتان، بات کو سیاق وسباق سے کاٹنے، بات کا مطلب کچھ سے کچھ نکالنے کی سوچ وغیرہ سب شامل ہیں۔یہ کام بالعموم بڑے اہل علم نہیں بلکہ کچھ سطحی قسم کے لوگ کرتے ہیں، مگر باقی لوگ خاموش رہ کر اس رویے پر مہر تصدیق ثبت کردیتے ہیں۔اس کا علاج صرف یہ ہے کہ مذہبی لوگوں کو سیرت طیبہ اور قرآن مجید کی اخلاقی تعلیمات کا گہرا مطالعہ کرنا چاہیے۔انھیں معلوم ہوجائے گا کہ جن چیزوں پر وہ دوسروں کے کفر و گمراہی کے فتوے دے رہے ہیں، ان کا فیصلہ تو اللہ قیامت کے دن کریں گے، لیکن اس اخلاقی رویے کے بارے میں وہ اپنا فیصلہ آج ہی دے چکے ہیں..... اس کی سزا جہنم کی ہلاکت ہے۔ویل لکل ھمزہ لمزہ،(الھمزہ)۔ان الذین فتنو المومنین والمومنات ثم لم یتوبو فلھم عذاب جھنم ولھم عذاب الحریق(البروج)۔

''تمہارے (مسلمانوں کے) خون، اموال اور عزتیں ایک دوسرے پر حرام ہیں، اس دن (عرفہ)، اس شہر (ذوالحجہ) اور اس شہر (مکہ) کی حرمت کی مانند۔کیا میں نے تم تک بات پہنچادی؟ صحابہ نے (بیک آواز) عرض کیا: جی ہاں۔''

آپ فیصلہ کرلیجیے

قرآن کریم اس بات میں بالکل واضح ہے کہ جنت کی کامیابی پاکیزہ انسانوں کو ملے گی، (اعلیٰ 14:87، شمس 9:91، طہ 76:20)۔مگر نفرت اور تعصب کا زہر انسان کی پاکیزگی کو ختم کردیتا ہے۔یہ انسان کے ایمان اور اخلاق دونوں کو آلودہ کردیتا ہے۔یہ انسان کو سچائی کو سننے اور قبول کرنے سے روکتا ہے۔یہ اپنوں کو بھی بے گانہ سمجھ کر ان سے کٹ جانے کا درس دیتا ہے۔یہ نبیوں کی تکذیب اور ان کے قتل جیسے بھیانک جرم کا ارتکاب کرادیتا ہے۔یہ انسانی معاشروں میں نفرت، انتشار، فساد اور قتل وغارتگری کا باعث بنتا ہے۔

اس کے برعکس پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ہستی جو تمام انسانیت کے لیے ہدایت اور اللہ تعالیٰ کی عظیم رحمت ہے، اس کا پیغام محبت اور رواداری ہے۔یہ اختلاف رائے کو برداشت کرنے کا سبق دیتی ہے۔یہ انسانوں کی ہدایت کے لیے تڑپنے سے عبارت ہے۔یہ حسن اخلاق سے غیر کو بھی اپنا بنانا سکھاتی ہے۔یہ صبر، تحمل اور دعا سے اللہ کی مدد طلب کرنے کا نام ہے۔

آج ہمارے سارے مسائل کا سبب سیرت حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر نفرت، حسد اور تعصب کے شیطانی طریقے کو اختیار کرنا ہے۔شیطان نے ہمارے باپ اور ماں سے حسد کی، نفرت میں مبتلا ہوا اور اس کا تعصب اتنا بڑھا کہ وہ عالم کے پروردگار کے سامنے سرکش ہوگیا۔اب ہمیں فیصلہ کرنا ہے کہ ہمیں شیطان کی پیروی کرنی ہے یا محبوبِ رحمٰن علیہ السلام کی پیروی کرنی ہے۔شیطان کی پیروی کی سزا باہمی انتشار، فساد اور ظالم حکمرانوں کا مسلط ہوجانا ہے۔حبیب پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کا بدلہ دنیا اور آخرت میں رحمت وبرکت ہے۔

ہمیں اپنے حالات بدلنے ہیں تو اپنا رویہ بدلنا ہوگا۔اب آپ ایک فیصلہ کرلیجیے۔اس کے بعد اللہ تعالیٰ اپنا فیصلہ ظاہر فرمادیں گے۔